

بھگوڑے

علی پور تینچھتے ہی ایلی نے شور مچا دیا۔ کبھی وہ فرحت کو آوازیں دیتا کبھی رابعہ کوتا کہ اس کی آمد کے متعلق شہراو کو علم ہو جائے لیکن شہراوہ رابعہ کے چوبارے کو چھوڑ کر اپنے چوبارے میں جا چکی تھی۔ اس نے ایلی کی آواز نہ سنی۔ پھر وہ اندر ہیری گلی کے راستے فرحت کی طرف چلا گیا۔

ایلی نے بہانہ بنایا۔ کہنے لگا۔ ”میرے افسر نے سرکاری کام سے امر تسریجیجا تھا۔ میں نے کہا وہ روز کے لئے علی پور بھی ہوا ہو۔“

وہ باتیں کر رہے تھے کہ ماحق مکان سے شور اٹھا۔ کوئی چیخ کر رہا تھا۔

”کون ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

اے ہے۔ صدر رہے۔ ہاجردہ بولی۔

”روتا کیوں ہے۔“

”کبھی رہتا ہے۔ کبھی نہتا ہے۔ کبھی سردیوارے دے ماتتا ہے۔ فرحت بولی۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”اب میں تمہیں کیا بتاؤ۔“

”کوئی پر دے کی بات ہے کیا؟“

”ہونہ پر دے کی۔۔۔“ فرحت چلائی۔

”تو پھر بتانے میں کیا حرج ہے۔“

بس واپس بجھنے آئی کوہے۔

”کیا مطلب۔“

”واکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اللہ ماری سپرٹ پی پی کر پھیپھڑا جل گیا ہے۔“

فرحت نے کہا۔

”بس آج نہیں تو کل۔ ہاجرہ کی پچھی نکل گئی تو کیوں روئی ہے اماں۔ فرحت نے
غصے سے کہا۔ اے ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ میرے بھائی کا پیٹا ہے۔ آخر۔
اچھاتوں میں چلتا ہوں۔ ایلی نے کہا۔

اے ہے کھانا تو کھالے فرحت نے کہا۔ میرا جی نہیں چاہتا۔ ایلی نے کہا۔ پاؤں
کی چاپ سن کر ایلی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں شہزاد کھڑی تھی۔
اس کے چہرے سے اداسی اور تنگری پک رہے تھے۔ کون شہزاد ہے۔ فرحت بولی۔
پہلے تو ناچتی دھما چوگڑی مچائی آیا کرتی تھی اور اب بی کی طرح دبے پاؤں آتی
ہے۔ وقت وقت کی بات ہے۔ شہزاد نے جواب دیا۔ یہ ایلی کب آیا۔“
”ابھی آیا ہوں۔ ایلی نے دنکھے انداز سے کہا۔ مجھے تو آج ڈر لگتا ہے۔ شہزاد
نے کہا۔

”تجھے اور ڈر فرحت نے کہا۔ وہ ڈر کے زمانے گز رگے؟ شہزاد نے آہ بھری۔
”بیت گئے۔ وہ بولی۔ کس بات کا ڈر ہے تجھے۔ ہاجرہ نے پوچھا۔

”پڑوں سے خیر کی آوازیں نہیں اٹھر ہیں۔ وہ بولی۔ ہاں وہ تو ہے ہی نہ جانے
کس وقت۔ فرحت رک گئی۔ تو ایلی کو لے جاتو اپنی طرف۔ ہاجرہ نے کہا۔ ہاجرہ کی
اس بار پوہ سب چونک پڑے۔ فرحت نے حیرت سے ہاجرہ کی طرف دیکھا۔

”اور جو کسی کو پتہ چل گیا تو۔ فرحت بولی۔ تو بھی کمال کرتی ہے اماں۔“
”ہم کسی کو بتائیں گے تو پتہ چلے گا۔ ہاجرہ نے کہا۔

فرحت غصے سے لال ہو گئی۔ واہ اماں واہ
ویے بھی تو اس نے جانا ہی ہے نا۔ ہاجرہ چلائی۔ ان دونوں کو آج تک تو کوئی
روک نہ سکا۔ اب فضول چڑھانے سے فائدہ۔“

ایلی اٹھ بیٹھا۔ چلو شہزاد۔ وہ بولا۔ میں چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔“

شہزاد نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اس کے آگے آگے چل

پڑی۔

اب کیا ہے

جب وہ چو بارے میں پہنچ تو شہزاد کے تینوں بچے سورہ ہے تھے۔ اسکی تین بڑی لڑکیاں صبیحہ نفیسا اور ریحانہ تو پہلے سے ہی گروپن کے سکول میں داخل تھیں چونکہ علی پور میں لڑکیوں کا یہی سکول نہ تھا۔ اس نے شہزاد نے گروپن بھیج دیا تھا جو علی پور سے بیس میل کے فاصلے پر تھا اور جہاں وہ بورڈنگ میں رہتی تھیں وہ لڑکے اور ایک لڑکی اور میں بیدی اور ناز اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ تینوں عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ لہذا شام ہی سے سوکے تھے۔ اس کی ملازمہ جانلوان دنوں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے لا ہو رگئی ہوئی تھیں کہاں کھالو۔ شہزاد نے کہا۔ میرا جی نہیں چاہتا۔ ایک پیالہ چائے کا پلا دوں البتہ۔ ایلی نے جواب دیا۔ وہ جو کہہ پڑیا تھا کہ رچائے بنانے لگی۔ ایلی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ویریک دنوں خاموش بیٹھے رہے۔ ہاجرہ نے بڑی جرات کی ہے۔ آج شہزاد نے کہا اور تم نے بھی۔ اب کیا ہے۔ اور پھر مدھم آواز میں گلگنا نے لگا۔

”اب جو کچھ گز نہ ہے جان پر گز رجائے۔“

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

ایلی سوچ رہا تھا۔ شہزاد بات کیوں نہیں کرتی۔ ویسے بلا بھیجا ہے۔ لیکن خاموش ہے۔ ”خطل گیا تھا۔“ شہزاد نے پوچھا۔ ہاں۔“ وہ بولا۔

”مجھے ملنے آئے ہو۔“

”ہاں۔“ اس نے جواب دیا۔ مجھے پتہ تھا تم آؤ گے۔ وہ بولی۔

”اچھا؟“ اس نے طنز کہا۔

”نہ بھی آتے۔ وہ بولی تو مجھے گلدہ ہوتا۔

اوہ۔ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

کہاں جا رہی ہو۔ ایلی نے پوچھا۔

معلوم نہیں۔

”پھر بھی۔“

”شاپید صفائی ہو جاؤں۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”مزدوری کر سکوں گا۔“

”مجھے ساتھ لے چلو،“ ایلی نے کہا۔

”اوہ ہوں۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔“

”بس نہیں کہہ جو دیا۔ وہ پھر خاموش ہو گے۔“

”ایک بات پوچھوں۔ ایلی نے کہا۔

”پوچھ۔“

”کیوں جا رہی ہو۔“

”اب اس گھر میں رہنا ناممکن ہو چکا ہے۔“

”کیوں۔“

”بے عزتی کی زندگی سے بھیک مانگ لینا اچھا ہے۔“

”شریف آیا تھا کیا؟“

ہاں۔

”کب آیا تھا۔“

”جس روز تمہیں خط لکھا تھا اسی روز گیا تھا وہ۔“

”کچھ کہتا تھا۔“

”بہت کچھ۔“

”کیا؟“

”چھوڑ واں بات کو۔ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”ادھر کا دروازہ ہندے ہے کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کدھر کا۔“

”فرحت کی طرف کا۔“

”نہیں تو۔“

”کراں۔“

”کیا فرق پڑتا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”اگر فرحت آجائے تو۔“

”اگر فرحت آجائے تو۔“

”اگر ہم کچھ کرنے لگ جائیں تو۔“

”تو کیا ہے۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

دیر تک وہ خاموش بیٹھ رہے۔ شہزادے چائے تیار کر دی۔

”میز پر کھدوں۔ وہ بولی۔

میہمیں رہنے دو۔ ایلی نے جواب دیا۔

بناؤ۔

”ہاں۔ تم پوچھو۔“

”پیوں گی۔“

”شہزادے۔“ وہ بولا کیا تم زندگی سے اکتا گئی ہو۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ابھی کہاں۔“

”اب تو وہ تڑپ نہیں رہی۔“

”اوہ ہوں۔“ وہ بولی۔ تڑپ تو ہے۔“

”تو پھر اداں کیوں ہو۔“

”اداں نہیں۔“ وہ بولی۔

”پھر“

”ڈری ہوئی ہوں۔“

”کس سے۔“

”اس شرابی پڑھی سے۔“

”صفدر سے۔“

”ہاں۔ روز میر اور واڑہ لٹکھاتا ہے کہتا ہے مجھے معاف کرو تو مروں گا۔ ورنہ نہیں۔“

”تو کرو معاف۔ ایلی نے کہا۔“

”ول نہیں مانتا۔“

”اتنی سخت گیر نہیں تو۔“

”عورت ہوں۔“ وہ بولی۔

”اوہ۔ اور وہ پھر خاموش ہو گئے۔“

دفعاً شہزاد بولی۔ تو ہاں کیوں کھڑی ہے یہاں آ جا۔“

ایلی حیران تھا کہ کس سے بات کر رہے ہے۔

فرحت مسکراتی ہوئے دروازے سے نکل کر اندر آ گئی۔ میں نے کہا دیکھوں تو کیا کر رہے ہیں۔ وہ بولی۔

”یہاں بیٹھ کر دیکھوں۔ شہزاد بولی۔ چھپ کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔“

”میں تو حیران ہوں۔ فرحت بولی۔ تم دونوں ہی عجیب ہو۔“

”کیوں۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”یوں بیٹھے ہو۔ جیسے صد یوں سے ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہو۔“

”وہ تو ہے۔ شہزادیوں سے اکٹھے رہتے ہیں ہم۔ کیوں ایسی۔“
”ہاں۔ ایسی نے کہا۔ صدیوں سے۔“
”اور میں سمجھتی تھی۔ فرحت ہنسی۔“

”تو جو جی چاہے سمجھتیرا کیا ہے۔ شہزادیوں۔“
اکیلی یادوں
فرحت چند ایک منٹ ٹھہری اور پھر بہانہ بنانا کر چلی گئی۔
اس کے جانے کے بعد وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔
”دیکھو شہزادی۔ ایسی انھوں بینکل اگر تم نے جانا ہے تو چلو۔“ کہتے چلیں۔
”بڑی بد نامی ہو گی۔“
”پھر کیا ہوا۔“
”تم برداشت نہ کر سکو گے۔“

”میری بات چھوڑو۔“ وہ بولا میں مرد ہوں۔ سبھی کچھ برداشت کر لوں گا۔ تم عورت ہو۔ میری تجھواہ بہت قلیل ہے۔ تم غربت برداشت نہ کر سکو گی۔ تم غربت سے واقف نہیں شہزاد اور اگر تم بچے چھوڑ جاؤ گی تو تم ان کی جدائی برداشت نہ کر سکو گی۔“

وہ خاموش رہی۔
”بولو۔ ایسی نے اسے جھنجھوڑا۔“
”میں تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ بولی۔“
”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“
”ہاں۔“ وہ بولی۔
”ایک بات کہوں۔ ایسی نے پوچھا۔“
”کہو۔“

”چلوس کا فیصلہ نہ تم کرو نہ میں کرتا ہوں۔“
”تو پھر۔“

”دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔ ایلی نے کہا۔
وہ کیسے۔

”آؤ پر چیاں ڈال لیں۔ ایک پر کھیں دو نوں دوسرا پر کھیل تم ایک پر پھی اٹھا
لو۔ اگر اکیلی کا اتو میں چپکے ہے چلا جاؤں گا اور اگر دو نوں کا اتو تم چپکے سے میری
ساتھ چل پڑنا۔“
وہ خاموش ہو گئی۔
”بول منظور ہے ایلی نے پوچھا۔
وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔

دیر کے بعد اس نے آہ بھری۔ چلوس اسی عمر جو اکھیا ہے تو اب کی بارہی شہزاد
بولی۔

”تو منظور ہوانا۔ ایلی نے کہا۔
”لیکن میری ایک شرط ہو گی۔ وہ بولی۔
”کیا؟“

” وعدہ کر کہا گرا کیلی کی پر پھی نکل آئی تو تم شادی کر لو گے۔ میرے جانے کے
فوراً بعد اور پھر زندگی بھر مجھ سے نہیں ملو گے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ایلی نے کہا۔

”میری خاطر ہمیشہ سب کچھ ہوتا آیا ہے۔ وہ بولی۔ یہ بھی ہو گا۔ جو بھی
میں چاہوں گی ہو کے رہے گا۔ وہ مسکرا دی۔
”کیا مطلب۔“

”میں ابھی جیتی ہوں۔ وہ بولی، مجھے مردہ نہ سمجھو۔ مجھ میں ابھی کسی بل ہے۔ اس

کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

”میری خاطر تم یہ بھی کرو گے دیکھ لینا۔“

”اور نہ کروں تو۔

”تو میرا آخری فیصلہ تم کن ہی چکے ہو۔“

”یعنی جوانہ میں کھیلو گی۔

”اوہ ہوں شہزادے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا۔ ایلی بولا۔ مجھے منتظر ہے۔“

” وعدہ۔“

”تمہاری قسم۔“

”مجھے تم پر یقین ہے۔“

”لیکن دونوں لکا تو میری بھی ایک شرط ہو گی۔ تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔ ایلی نے کہا۔

”کیا؟“

”اگر بچوں کو ساتھ لے جاؤ گی تو غربت برداشت کرنی پڑے گی اور اگر بچوں کو ساتھ نہ لے جاؤ گی تو ان کا غم نہ کھانا۔ ورنہ تمہاری زندگی تلخ ہو جائیگی۔“

”ہوں۔“ وہ سوچنے لگی۔

”میں بتاؤں۔ ایلی بولا۔“

”کیا۔“

”تم اڑکیوں سے پچی بات کہہ دینا اور پوچھا لینا۔ انہیں یہ بھی بتا دینا کہ بھوکوں مرننا پڑے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ بولی۔

”تو پر چیاں لکھ دو۔“

وہ اٹھی۔ ٹرنک سے کاپی کا ورق پھاڑا۔ پنسل لی اور لکھنے بیٹھ گئی۔

دفعتہ اے کیا ہوا۔ اسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہاتھ کا پنے لگا۔ اس نے پنسل میز پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں میں سرخام کرو نے لگی۔

شہزاد، شہزاد، ایلی نے اے جنجنحوڑا لیکن وہ جوں کی توں پتھر کی طرح بیٹھی رہی۔

میں نہیں مرؤں گا

عین اس وقت ماحقہ کمرے سے شور سنائی دیا۔

”نہیں نہیں۔ میں نہیں مرؤں گا۔ نہیں مرؤں گا۔ صدر چلا رہا تھا وہ کمرے میں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔

”نہیں نہیں نہیں نہیں۔ وہ چلائے جا رہا تھا۔

شہزاد نے سراہیا اور غور سے سنتے گئی۔

منھی کے ابا منھی کے ابا صدر کی بیوی اس کی بیوی کی تیس کر رہی تھیں۔ خدا کے لئے ان چھوٹے چھوٹے بچوں کے لئے۔“

”چلی جاؤ چلی جاؤ۔ وہ چلا نے لگا۔

”ان بچوں پر حرم کرو۔ میں تمہارے پاؤں پر قی ہوں۔ وہ رو رہی تھی۔

”اپنے آپ پر حرم کرو۔ یہ زہر نہ پیو۔ اس کی بیوی بولی۔

”ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ، دفع ہو جاؤ۔ وہ چیخ رہا تھا۔

”خدا کے لئے خدا کے لئے۔ وہ کراہ رہی تھی۔

پھر ماحقہ کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے

”شہزاد۔ ایلی بولا۔ کیا سوچ رہی ہو؟“

”کچھ بھی نہیں۔“

”میری طرف دیکھو۔“

شہزاد نے سراہیا۔ اس کی گالوں پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔

ایلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے صدر کے متعلق کوئی بات تھی۔ جو شہزاد چھپا رہی تھی۔

وہ تو طبعاً بے نیاز تھے۔ کسی بات کو درخواست نہیں سمجھتی تھی۔ پھر کیا بات تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”شہزاد۔ وہ بولا۔ آخر بات تو ہے کوئی۔“

”کچھ بھی نہیں۔ وہ بولی۔ اچھا تو یہ پڑپاں تو لکھو۔“
”لکھتی ہوں۔ وہ بولی اور ویسے ہی بت بنی بیٹھی رہی۔
لحقة کمرے میں بالکل خاموش تھی۔ صرف لمبے سانس لینے کی آواز آ رہی تھی۔

دیر تک وہ پھر خاموش بیٹھے رہے۔ لحقة کمرے سے ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔ کوئی دیوار بجا رہا تھا۔ شہزاد کے کان کھڑے ہو گئے۔

”دیوار بجا رہا ہے کیا۔ ایلی نے پوچھا۔“

”شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔“

”کون ہے۔“ اس نے پوچھا۔

شہزاد نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

ایلی بجھ گیا۔ لیکن صدر دیوار کیوں بجا رہا ہے۔ یہ اسے سمجھ میں نہ آیا۔

”مجھے معاف کرو۔ مجھے معاف کرو۔ صدر کی مدھم آواز سنائی دی۔“

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

”وہی ہے کیا۔ ایلی نے پوچھا۔“

شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کہہ دو معاف کرو۔“ ایلی نے کہا۔

شہزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کہہ تو معاف کرویا۔ ایلی نے کہا۔

شہزادے برائے منہ بنایا، دل نہیں مانتا۔ وہ بولی۔

”تو جھوٹ موت کہہ دو۔ ایلی نے کہا۔

”جب تک میں نہیں مروں گا۔ صدر بیان اور ازبانہ چیختے لگا۔ حتیٰ کہ اسے کھائی کا دورہ پڑ گیا اور کہہ کیوں نہیں دیتی۔ ایلی نے پوچھا۔

ساری عمر جان کی کے عذاب میں بتلار ہے۔ شہزادے بولی۔

ایلی نے حیرت سے شہزادے کی طرف دیکھا۔ کیا یہ شہزادے بول بھی نہیں۔ وہ تو اتنی سخت دل نہیں۔ پھر کون بول رہی تھی۔ ایلی کے لیے شہزادے کی شخصیت کا یہ پہلو نیا تھا۔ جس سے وہ آج تک واقع نہ ہوا تھا۔

کچھ دری ماحقة کمرے پر خاموش چھائی رہی۔ پھر دیوار پر پھر سے لک لک ہونے لگی۔

”کہہ کیوں نہیں دیتی۔ ایلی بولا۔

شہزادہ خاموش بیٹھی رہی۔

”میری خاطر کہہ دو۔ ایلی نے منت کی۔

”جی نہیں مانتا۔ وہ بولی۔

”کہہ دیتی ہوں۔ صرف ہونٹوں سے۔“

”تو کہہ دو۔“

شہزادے ٹرک سے تالہ اٹھایا اور اسے دیوار پر مارنے لگی۔ ٹھک ٹھک ٹھک پھروہ رک گئی۔

صدر نے پھر تالہ مارا ٹھک ٹھک ٹھک

دفعتاً صدر چلا یا یہ تم ہوت، ہو۔ بولو۔“

”ہاں“ وہ بآواز بلند بولی۔ میں نے معاف کیا۔“

ملحقہ کمرے سے نعروں کی آوازیں آئے لگیں۔ کوئی جیخ رہا تھا۔ ناج رہا تھا۔ تھیقہ مار رہا تھا۔ کھانسی پھر چڑھنی۔ پھروہی قتے کرنے کی آواز اور پھر خاموشی چھا گئی۔

دیر تک ووونوں خاموش بیٹھے رہے۔

”اب پر چی کھوئا ہے میں نے کہا۔“

”ہاں پر پیسی۔ شہزاد کو یا خواب سے بیدار ہوئی۔“

پر چیاں لکھتے وقت اس کا با تھکان پ رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اس نے کانپتے ہوئے بائیوں سے کاغذ کے ان دوں پر زوں کو تہہ کیا اور بولی۔ اب اٹھاؤ۔“

”میں نہیں۔ ایلی بولا۔“ تم اٹھاؤ۔ ایلی نے پر چیزوں کو مٹھی میں لے کر ہلا�ا۔

شہزاد نے ایک پر چی اٹھائی۔ کھولو۔“ وہ بولی۔

”نہیں تم خود کھولو۔“ سنے کہا۔

شہزاد نے اسے کھولا۔ دوں دیکھ کر وہ مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

عین اس وقت ملحقہ کمرے میں صدر کی بیوی کے بین شروع ہو گئے۔

ایلی چونکا۔ کیا مر گیا؟“ وہ بولا۔

”ہاں۔ شہزاد نے جواب دیا۔ جان چھٹی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو روائ تھے۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آنسو غم کے تھے یا خوشی کے۔

تم اب جاؤ۔ شہزاد بولی۔ مرگ پر سارے محلے والے اکٹھے ہوں گے۔“

اچھا۔ ایلی نے کہا۔ کل میں چلا جاؤں گا۔ انتظام کرنے کے لئے۔ انتظام کر کے واپس آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔“

شہزادے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولگا۔ وہ بولی۔

”نہیں۔“ ایلی بولا جلد آؤں گا۔ وہ دبے پاؤں فرحت کے گھر کی طرف چل پڑا۔

وکیل میم

لاہور پہنچ کر ایلی سوچنے لگا کہ اسے تیاری کرنی ہے۔ اسے قانون سے چند اس واقعیت نہ تھی اور نہ اسے کسی اڑکی کو بھگا کر لے جانے کا تجربہ تھا۔ شہزادے کئی بار اسے بتایا تھا کہ شریف کیا تھا اگر ایسی واردات ہو جائے تو وہ قانونی طور پر کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ میدان میں آ کر لانے کی بجائے شاید وہ خود معدوم ہو جائے گا۔

بہرحال اگر اس نے کوئی اقدام کیا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قانونی طور پر وہ کس طرح زد میں آتا ہے۔ ایلی نے کورٹ روڈ پر چکر لگانے اور وکلاء کے بورڈ پڑھنے لگا۔ میدان میں آ کر لانے کی بجائے شاید وہ خود معدوم ہو جائے گا۔

بہرحال اگر اس نے کوئی اقدام کیا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ قانونی طور پر وہ کس طرح زد میں آتا ہے۔ ایلی نے کورٹ روڈ پر چکر لگانے اور وکلاء کے بورڈ پڑھنے لگا۔ لیکن اس میں اس قدر رہمت نہ پڑتی تھی کہ کسی وکیل کی پاس جائے۔

انپی کوٹھی کے باخچے میں ایک معمر وکیل کو بیٹھے دیکھ کر اس نے اندر واخل ہونے کی شدید کوشش کی لیکن اس کے قدم رک گئے عین اس وقت وکیل کافشی آ گیا۔

”کیوں مہاراج، وہ بولا، آپ لا لہ جی سے ملیں گے۔

”ہاں۔“ ایلی نے مشکل سے کہا۔

”تو آ وہ سامنے بیٹھے ہیں۔

ایلی کو مجبوراً لا لہ جی کے پاس جانا پڑا۔ آداب عرض۔ وہ بولا۔

”نمیتے۔“ وکیل نے جواب دیا اور کتاب ایک طرف رکھ دی۔ ہوں کیا بات ہے۔

”مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ حقے کا کش لے کر بولے۔

”انقوا کا کیس ہے۔ ایلی نے بصد مشکل کہا۔ پھر وہ گھبرا گیا۔ میرا مطلب ہے۔

ایو پمنٹ کا۔ یعنی وہ رک گیا۔ اس کا گلوکھا کیا تھا۔

”کیا کیس ہے۔“ وہ بولے۔

”اگر ایو پمنٹ کی جائے تو اس میں قانونی زد کیا کیا ہو سکتی ہے۔“

”یو کو اُف پتھر ہے۔ لالہ جی بولے۔

”میرا مطلب ہے۔ ایلی نے بصد مشکل کہا۔ کیا کو اُف ہونے چاہیں؟“

”یعنی کیا مطلب ہے؟“

”مطلب ہے یعنی۔“

”دیکھو جوان، لالہ جی بولے۔“ کیا ارتکاب جرم ہو چکا ہے؟“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

لالہ جی قہقہہ مار کر رہنے لگے۔

”کیا تم اسکے ہیر و ہو گے۔ لالہ جی نے پوچھا۔

”جی۔“ ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”لڑکی کی عمر کیا ہے؟“ وہ بولے۔

”عمر۔“ ایلی کے گلے میں کچھ پھنس گیا۔ معلوم نہیں۔ وہ بولا۔

”پھر بھی اندازا۔“

”اس کے چھپے ہیں۔“

لالہ جی کی آنکھیں ابل آئیں۔ ”نوجوان وہ بولے تمہیں کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہیے وکیل سے نہیں۔“

لالہ جی کی کوٹھی سے نکل کر ایلی نے اطمینان کا سنس لیا۔ کچھ پروانہ نہیں۔ اس نے

اپنے آپ کو تسلی دی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ اور لالہ جی سے ملنے کی کوفت مٹانے کے لیے وہ سینما ہاں میں جا گھسا۔

سینما سے نکل کر جب وہ انارکلی میں جا رہا تھا تو محمود کو دیکھ کر ٹھنٹھلا۔ ارے تم۔ میں یہیں ہوں۔ محمود بولا۔

”یہاں تبدیلی ہو گئی ہے کیا۔“

”فہیں چھٹی پڑھوں۔ محمود نے کہا، لمبی چھٹی پر۔“

”کیوں؟“

”یہاں کا جگہ میں داخل ہو گیا ہوں۔ بی آئے گر رہا ہوں۔“

”ارے۔ اور زر۔“

محمود نہ سنا۔ پر ایا دھن۔ وہ بولا۔

”کس کا۔“

”اسی کس کا۔“

”میری میم کا۔“

”ارے کیا وہ تمہاری بن گئی ہے۔“

”شاید نہ بنتی لیکن مسٹر قلب نے اس روز حملہ کر کے اسے اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا۔“

”وہ کس طرح۔ ایلی نے پوچھا۔

”بھتی عورت ہے۔ ضد میں آگئی۔ بولی یوں ہے تو چلو یونہی سہی۔“

”تو وہ میم کہاں ہے آج کل۔ ایلی نے پوچھا۔

”میرے پاس ہے۔“

”کہاں؟“

”مکان کرانے پر لے رکھا ہے۔ چلو گھر چلیں۔ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔“

گھر جا کر ایلی نے محمود کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ محمود پشاگیا۔ ارے چھوپھوں کی ماں کو انخوا کر رہے ہو۔ بلکہ وہ تمہیں انخوا کر رہی ہے۔ یا راگر خاوند نے قانونی چارہ جوئی کی تو اندر ہو جاؤ گے۔“

”پھر کیا ہے۔ ایلی بولا۔ مجھے ذرا وغیرہ میں مشورہ نہ دو۔ مدد اور کرو۔“

”جتنی مدد کہو گے کروں گا۔ بشرطیکہ میں قانون کی زندگی میں نہ آؤں۔ محمود ہٹھنے لگا۔

”چھوپھوں کی ماں ہے وہ کیا۔ میم نے مسکرا کر پوچھا۔

”جی ہاں۔ ایلی نے جواب دیا۔

”تمہارا رومنس ہے۔ اس نے پوچھا۔

”سو لہ سال سے۔ ایلی نے جواب دیا۔

”سو لہ سال، اس کی آنکھوں میں چمکا ہر ای۔

”حرامزادی۔ محمود غصے میں چلا یا۔ اس کی آنکھ کی چمک دیکھو۔“

”تم تو خواہ نخواہ بگزتے ہو۔ میم نے یوں لاذ سے جیسے پچی ہو۔

”ابھی رومنس کی لوت نہیں گئی کیا۔“ محمود نے اسے پکڑ کر گرا لیا اور اونڈھا کر کے اس کے چورڑوں پر یوں لکے مارنے لگا۔ جیسے سکول کی پچی کو سرفراش کر رہا ہو۔

”ہائے مری ہائے مری۔ میم چلا رہی تھی۔

”میرے دوست پر لچائی نظریں ڈاتی ہے تو۔ محمود فرار ہاتھا۔

ایلی حیران تھا۔ اس کے زہن میں میم کا تختیل کچھ اور تھا۔ یہ عجیب میم تھی اور محمود عجیب آدمی تھا۔ جو میم کا محتاج ہونے کے باوجود وادے یوں پیٹ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہاؤس میڈ ہو۔

بہر حال محمود سے کوائف طے کرنے کے بعد وہ ڈیرہ آگیا۔

تیرہ نقط

ڈیرہ پہنچ کر بھی اس کے کانوں میں محمود کا مشورہ گونج رہا تھا۔ محمود نے کہا تھا۔ ایک

بات یا درکھو۔ اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنا۔ روپوش نہ ہو جانا ورنہ مارے جاؤ گے۔“

ایلی نے ڈیرہ پہنچ کر اس کے توسط سے ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ تاکہ شہزادوں کو وہاں رکھ سکے اس انظام کے باوجود وہ سخت گھبرا یا ہوا تھا۔

پہلے روز جب وہ غلام کے گھر گیا تو غلام اسے دیکھ کر بولا۔

”کیوں خیریت تو ہے۔“

”بالکل،“ ایلی نے جواب دیا۔

”معلوم تو نہیں ہوتی۔ غلام نے کہا۔“

نہ جانے کیا بات تھی۔ ہر کوئی اس سے یہی سوال اپوچھتا تھا۔ کیا واقعی اس کے چہرے پر پریشانی اور تنگی کے آثار اس حد تک نہیں تھے۔

”الیاس بھائی۔ وہ بولا غلام نے پیارے ایلی کا بات تھا قائم لیا اور بولا۔ بھائی ایک بات کہتا ہوں۔ جو بھی کرنا ہے کر ڈالو۔ سوچو نہیں ورنہ سوچ کا آرا چلتا ہے۔ ہری طرح چلتا ہے۔“

ایلی کئی بار چاہتا تھا کہ غلام سے ساری بات کہہ دے۔ لیکن اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔

ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس روز بھی اس نے بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ پھر جب وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا تو نورانی خلاف معمول ایلی کے کمرے میں آگیا۔

”الیاس صاحب۔“ وہ بولا معاف کیجئے میں نے دیکھا ہے کہ آپ سخت پریشان ہیں۔“

ایلی نے محسوس کیا کہ اسے جیٹلانا بے کار ہے۔ ”ہاں ہوں۔“ وہ بولا۔

”میں کوئی مدد کر سکتا ہوں کیا؟“

”نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر؟“

”بات یہ ہے نورانی صاحب کہ میں مستقبل کے متعلق پریشان ہوں۔ ایلی نے جواب دیا۔

”تو میں آپ کو مدد کر سکتا ہوں۔ نورانی بولا۔ ضرور کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”میں علم جفر سے واقف ہوں۔ نورانی نے کہا۔ کیا آپ اپنا سوال مجھے بتاسکتے ہیں۔“

”نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ ایک راز ہے۔“

”اچھا۔“ نورانی نے کہا۔ ”تو آپ شہزادیے۔ میری بڑیات پر عمل کیجئے۔“

”وہ کیسے؟“

”اپنا سوال تیرہ الفاظ میں لکھ دیجئے۔ نورانی کہنے لگا۔“ شرط یہ ہے کہ الفاظ تیرہ ہوں نہ کم نہ زیادہ مثلاً کیا میں لی اے کے امتحان میں پاس ہو جاؤں گا۔ جو اسال ہو گا۔ دیکھئے اس سوال میں تیرہ الفاظ ہیں اور اس کا متن معانی کے لحاظ سے مکمل ہے۔“

اس کے بعد نورانی نے ایلی کو ایک لمبا چوڑا عمل بتایا۔ ان الفاظ کو ابجد کے ہندسون میں بدلتا تھا اور اسی طرح تیرہ مرتبہ بدلتا تھا اور پھر ان کا مجموعہ نکالنا تھا۔ نورانی پیٹھے گیا اور اس عجیب و غریب عمل میں ایلی کی مدد کرنے لگا۔ جب مجموعہ نکال چکا تو نورانی بولا۔ ”اب ذرا خبہریئے۔ میں باہرجا کر ستاروں کی پوزیشن دیکھ لوں۔“

ایسا ہی ایک جملہ آپ لکھیں جس میں پورا مفہوم موجود ہو۔ مجھے بے شک نہ بتائیں۔

ایلی نے تیرہ لفظوں کا جملہ لکھا۔

کیا یہ اخو امیرے اور شہزادے کے لئے باعث خوشی یا پریشانی ہو گا۔

نورانی باہر نکل گیا اور وہاں کھڑا گویا عجیب منظر پڑھتا رہا۔ مشتری، اسد، زہرہ، هر طان اور نہ جانے کیا کیا نام لیتا رہا۔

پھر وہ اندر آگیا۔ ”ستاروں کے لحاظ سے۔“ وہ بولا۔ آپ اس مجموعے میں جمع کر لیجھے۔ ۲۱۵

”جی،“ ایلی نے جمع کر کے کہا۔

”اب آپ از سرفہرست میں بدلتے جائیں۔“

ایلی نے ایسی ہی کیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے پتیرہ الفاظ کا ایک تکمیل جملہ بننا ہوا تھا۔

”یہ فعل آپ کے اور ایسا حقیقی کے لئے باعث قائل و رسولی ہو۔“

”کیا میں جواب دیکھ سکتا ہوں۔“ نورانی نے کہا۔

ایلی نے وہ چٹ جس پر جواب لکھا تھا۔ نورانی کی طرف بڑھاوی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ چہرے پر ہوا بیاں اثر رہی تھیں۔

”مجھے افسوس ہے۔“ نورانی بولا۔

”مجھے بھی ہے۔“ ایلی نے کہا، لیکن میرا فیصلہ بدلتے نہیں سکتا۔“

”الیاس صاحب۔“ نورانی بولا، میں ووست ہوں ناصح نہیں البتہ اگر کبھی میری مدد کی ضرورت پڑ جائے تو آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر نورانی باہر نکل گیا۔

”یہ ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔ اللہ اچھا کریں گے۔ حاجی صاحب کی گردن روئی کے گلے کی طرح لرز رہی تھی۔

”اپنے آپ سے لڑو۔“ غلام مسکرا رہا تھا۔ جو کرنے ہے کروالو۔ کروالو۔“

”تم قید ہو جاؤ گے۔ محمود چلا رہا تھا۔

”تمہیں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیے۔ لا الہ جی اسے گھور رہے تھے۔

آنٹھر روز کے بعد ایلی لا ہور نیشن پر بے تابی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

شہزادی کی لڑکیوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہر حالت میں ماں کا ساتھ دیں گی۔

انہیں غربت اور بھوک کی تکلیف کا تصور ہی تھا۔

شہزادی کی تینوں بڑی لڑکیاں ہنسوڑ تھیں۔ وہ ہر بات پر بُشی تھیں۔ بنے چلی جاتی تھیں۔

بات بات پر ان کی صرفت میں یوں ابال آتا تھا۔ جیسے سوڑے میں نمک کی چنکلی ڈال دی ہو۔

سب سے بڑی سوچتی تھی اس کا چہرہ بے حد عصوم تھا۔ طبیعت میں بلا کی سادگی تھی۔ لیکن وہنی چمکتی تھی۔ نفیسہ اس سے چھوٹی تھی اس کا رنگ سانو لا تھا۔ وہ بے حد تیز اور ذہین تھی۔ لیکن بات بات پر ہنسنے میں وہ نفیسہ کی ساتھی تھی۔ تیری جسمانی

طور پر بھر صبیحہ اور نفیسہ کی طرح رنگیں نہ تھیں۔ اسے مزاج پیدا کرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ

انہوں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی بات بات پر ہنسنا سیکھ لیا تھا۔ طے شدہ انتظارات

کے مطابق شہزادی نے علی پور سے گرد پتن لڑکیوں سے ملنے جانا تھا اور پھر گور پتن سے

محمود نے انہیں لا ہو رلے آنا تھا۔ جہاں سے ایلی انہیں ڈیرہ لے جا رہا تھا۔ ڈیرہ

میں ایلی نے خفیہ طور پر ایک الگ مکان ان کی رہائش کے لئے کرایہ پر لے رکھا تھا۔

ایلی سخت گھبرا�ا ہوا تھا۔ مگر جب وہ لا ہو رپنچھے اور ایلی انہیں لے کر ڈیرہ کی گاڑی میں بیٹھ گیا تو شہزادی کی لڑکیوں کی مسلسل ہنسی نے اس کا فکر دور کر دیا۔

ایلی جیران تھا۔ انہیں خطرے کا احساس نہ تھا۔ شہزاد خاموش تھا۔ لیکن جب ایلی

نے خطرے کا ذکر کیا تو وہ نہ پڑی۔ وہ بولی۔ ہمارا کوئی کیا بگاڑے گا۔ جہاں جی چا

ہے گا رہیں گے جہاں نہیں جی چاہے گا نہیں رہیں گے۔ اب مزید بے عزتی برداشت نہ ہوئی آج تو چلی آئی۔ لڑکیاں اپنی مرضی سے آئی ہیں۔ واپس لینا چاہے ہے

تو لے لے۔“

”لیکن اگر اس نے چارہ جوئی کی تو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پڑا کے میں بھری پچھری میں جواب دوں گی اسے تم کیوں غم کھاتے ہو۔“ وہ بولی۔

انہیں ڈیرہ میں رہتے ہوئے دش روز ہو گئے۔ لیکن کوئی ایسا واقعہ نہ ہو جو باعث فکر ہوتا۔ گیارہویں دن محلے کے ایک بزرگ سکول میں آگئے اور ہیئت ماشر کے توسط سے ایلی سے ملے۔ ایلی کو یہ خیال ہی پیدا نہ ہوا کہ وہ شہزاد کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ایلی انہیں اپنے گھر لے گیا۔ جب انہوں نے گھر کو فور سے دیکھنا شروع کیا تو ایلی کا ماتھاٹھنا کا۔

پچھدیو کے بعد انہوں نے ایلی سے باتیں۔
بولے۔ ”بھی بات یہ ہے کہ مجھے شریف نے یہاں بھیجا ہے۔“
”شریف نے؟“

”ہا۔“ وہ بولے۔ شاید تمہیں علم ہو گا کہ شہزاد اپنے تمام بچپنکر چلی گئی ہے۔“

”چلی گئی ہے؟“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”یہاں ہم صرف اس لئے آئے ہے کہ تم سے کہیں کہ تم شہزاد کی مدد کرنا ورنہ خواہ مخواہ وقتیں بڑھ جائیں گی۔ چونکہ شریف کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں سخت کارروائی کرے گا۔“

وہ بزرگ کرنے والے دھمکیاں نہیں دیتے کر گزرتے ہیں۔“

بہر حال اس بزرگ کے آنکا یہ نتیجہ ہوا کہ ایلی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈیرہ نہیں رہیں گے اور اگلے روز ہی وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر جملہ لوگوں کو ساتھ لے کر امر ترچلا گیا۔

طوفان

اونہر شریف چھٹی لیکر علی پور آگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اسکے بنائے گھر میں

دھول اڑگئی ہے۔ اس کی بیوی اور بچے تمام اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں تو اس میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہوئی۔ وہ شریف جس نے کبھی محلے میں سرناٹھا یا تھا۔ جسے کسی نے اوپنی آواز سے بات کرتے ہوئے نہ سنایا تھا۔ جس کی آواز تک کبھی محلے میں نہ گونجی تھی وہ شریف احاطے کے میدان میں آ کھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے کلف جاری تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ محلے والوں کے احساس خوداری کو لکا را رہا تھا۔ لوگوں کو غصہ دلا رہا تھا۔ اپنی لشی ہوئی دنیا کا واسطہ دے کر انہیں علی احمد کے گھرانے کی خلاف ابھار رہا تھا۔

شریف کی آوازان کر محلے کی عورتیں کھڑکیوں میں آ گئیں انہوں نے ہاتھ چلا چلا کر شریف کی شرافت کو سراپا۔ جو قلم اس پر ہوا تھا اس میں رنگ بھر کر شہزادے کے قصے بیان کئے اور شریف کو مزید ابھارا۔ اس محلے کے مرد اکٹھے ہو گئے۔

”ان کا حقہ پانی بند کر دو۔“ کسی نے نعرہ بلند کیا۔

”بند کر دو بند کر دو۔“ وہ نعرہ چاروں طرف گونجا۔

عورتوں نے علی احمد کے خاندان کے جملہ لوگوں پر لغتیں بھیجنے شروع کر دیں۔ مردوں نے لٹھاٹھا کر لہائے نوجوانوں نے قسمیں کھائیں۔

”محلے سے نکل جاؤ۔“ وہ چلائے ”نکل جاؤ۔“

گھر میں ہاجرہ فرحت سیدہ سب سہی بیٹھی تھیں۔ ان کے دروازے پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ان کے خلاف آواز بلند ہو رہی ہے تھی۔ لیکن علی احمد اطمینان سے گھر میں بیٹھے روز کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

”میں کہتی ہوں یا میں ہی کا کام ہے۔“ ایک بولی۔

”جو جو یہاں ہوتا رہا ہے اسے دیکھ کر ہماری تو آنکھیں پک گئی تھیں۔ گند مچار کھا تھا اس اللہ کی بندی نے۔“

اعلانیہ ملتے تھے وہ کیوں ماں۔“

”بالکل لیکن خاوند نے آنکھیں موندر کھیلی تھیں۔ ہم کس منہ سے بات کرتے۔“
”اے سچ پوچھو تو شریف کی شرافت نے جلتی پر تیل ڈالا۔ ورنہ انہیں اتنی جرات
نہ ہوتی کبھی۔“

”وہ کہتے ہیں نا کہ گر بائشتن رونج اول۔“
 محلے کے اس طوفان نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ علی احمد اور ہاجرہ سے متعلقہ
 پرانی دشمنیاں جاگ اٹھیں۔ لوگ پرانے انتقال لینے پر آمادہ ہو گئے اور شریف کو
 خوفناک مشورے دینے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریف نے شہزادے کے بجائے نابالغ
 لڑکیوں کے انزوا کا مقدمہ دار کرویا۔ پھر نہ جانے انہیں کہاں سے خبر مل گئی کہ ایلی
 امرتر میں چھپا ہوا ہے۔ وہ سب لاٹھیاں اٹھا کر امرتر آگئے۔

ایلی جو نبی امرتر پہنچا تو نہ جانے لیا ہوا۔ اس کے چہرے پر پھنسیاں تکل آئیں
 اور پھر سب پھٹ گئیں۔ ان میں سے پانی رستے لگا۔ ایلی کو کسی اچھے ڈاکٹر کا پتہ نہ
 تھا۔ چونکہ امرتر کا وہ علاقہ جس میں انہیں مکان ملا تھا۔ بالکل نیا تھا۔ جس سے ایلی
 واقف نہ تھا۔ لہذا اس نے گھر سے وورجانا مناسب نہ سمجھا ان کے گھر کے قریب ہی
 ایک جراح کے دوکان تھی وہ جراح کی پاس چلا گیا۔

”یہ کیا لکلا ہے مجھے۔“ اس نے جراح سے کہا۔

”یہ اگر زیما ہے۔“ جراح نے کہا ”میرے پاس اس کا خالص علاج ہے۔“ جراح
 نے پرانے کپڑے کا بڑا سامگڑا جلا کیا اور جلے پڑے کپڑے کو ان سوراخوں میں بھر
 دیا۔ جو ایلی کے منہ پر پھنسیوں کے پھوٹنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ ایلی نے
 آئینہ دیکھا۔ اس کی ہنسی تکل گی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سرکس کا کارٹون ہو۔
 وہ دوکان سے باہر نکلنے لگا تو اس نے دیکھا کہ محلے کیسات افراد ہاتھوں میں
 لاٹھیاں لئے آ رہے ہیں۔
 ایک ساعت کے لئے وہ ٹھنڈھ کا پھر پتھر بن کر کھڑا ہو گیا۔

قریب آ کروہ رک گئے پھر ساتھ والے دوکان دار سے کہنے لگے۔ شیخ عثمان
صاحب آپ نے ہمارے محلے کا کوئی شخص تو نہیں دیکھا؟“

”نہیں تو۔“ عثمان نے جواب دیا۔ پھر وہ آگے کی طرف چل پڑے۔

ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ محلے والے سے تلاش کر رہے تھے۔ اگر اس کامنہ
نہ پھٹایا اس پر جلی ہوئی وجہیاں نہ لگی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہوتا۔

ایلی کھر پہنچا تو کھر کا نقشہ ہی اور تھا۔ وہ سب تاش کی گزدی سامنے رکھے بیٹھے
ہوئے تھے۔ نفیسلہ ناج رہی تھی۔ صبیحہ اور ریحانہ اس نہ سر دوہری ہوتی جا رہی
تھیں۔ اولیں چلا چلا کرنے جانے کیا اعلان کر رہا تھا۔ نازتا میاں پیٹ رہی تھی۔ اور
بیدی چپ چاپ کھڑا کھڑا باقاعدہ۔

”او اللہ کے بندو مجاہدو۔ کچھ خبر ہے۔ محلے والوں کے جتنے امرتر کا چپے چپے چھان
رہے ہیں۔ ہمیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہاتھوں میں لاٹھیاں اٹھائے ہوئے ہیں۔“

”کرنے دو تلاش۔“ شہزاد بولی۔ ”ڈھونڈ بھی لیا تو کریں گے کیا۔“

”مجھے ملے تھی۔ ابھی۔“ ایلی نے کہا۔ فعتا انگلی لگاہ ایلی کے چہرے پر منعطف
ہو گئی وہ سب قہقهہ مار کر ہٹنے لگے۔ یہ کیا حلیہ بنایا ہے پچاچا جان۔“

”یہ حلیہ نہ بنانا ہوتا تو وہ گھیٹ کر لے گئے ہوتے۔ ایلی بولا۔

لیکن وہ سب موقع کی زناکت کو سمجھنے سے منکرتھے انہوں نے ایک اور قہقهہ بلند کیا
ایلی محسوس کرنے لگا جیسے وہ کسی زندہ ناج اور گانا کمپنی کا جو کر ہو۔

صحرا میں نخلستان

اگلے روز بارہ بجے کے قریب دروازہ بجا۔

”یا اللہ یہ کون ہے۔“ ایلی کا دل ڈوب گیا۔

”الیاس صاحب۔“ کسی نے آواز دی۔

ایلی گھبرا گیا۔

شہزاد اٹھ چکھی۔ ” میں دیکھتی ہو کون ہے۔ ”

” نہ نہ ” اس نے شہزاد کو روکا مگر وہ جا چکی تھی۔ کچھ دیر وہ دروازے میں کھڑی باقی کرتی رہی پھر آ کر کہنے لگی ” کوئی ڈیرہ کا ٹیچر ہے کہا ہے میرا نام شیخ ہے تم سے ملنے آیا ہے۔ ”

” لیکن اسے ہمارے گھر کا علم کیسے ہوا۔ ”

” یہ نہیں مجھے معلوم ہے وہ بولی۔ ”

ایلی ڈرٹا ڈرٹا بہر لکلا reserved © 2002

” اسلام علیکم ” شیخ سے دیکھ کر چلایا۔ بھی بات یہ ہے کہ میں نے کل تمہیں دیکھا تھا پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ تم ہو۔ پھر آج میں نے تمہیں پیچان لیا۔ اس نے ملنے چلا آیا۔ ”

” لیکن تم یہاں کہاں ہے ایلی نے پوچھا۔ ”

” بھی یہ ساتھ والا مکان میرا ہے۔ میں امر ترکار ہنے والا ہوں نا آٹھ روز سے چھٹی پر ہوں ۔ ”

” شیخ صاحب کیا کسی اور کو بھی علم ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں ۔ ”

” بالکل نہیں وہ بولا۔ گھبراو نہیں۔ میں معاملے کی اہمیت کو سمجھتا ہوں ۔ ”

” کیا مطلب؟ ”

” بھی تمہارے متعلق خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔ ”

” اخباروں میں؟ ”

” ہاں۔ ” وہ بولا اور تم بالغ لڑکیوں کے انفو کا مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔ ”

ایلی سخت گھبرا گیا۔

” اچھا ہوا تم یہاں آگئے ہو۔ شیخ نے کہا۔ ” یہ میرا اپنا محلہ ہے انشاء اللہ تمہیں کوئی زک نہ پہنچے گی۔ میرے سگے بھائی وکیل ہیں۔ چلو ان سے مشورہ کرلو۔ ”

شیخ ریحان ذیرہ کے مدرسے میں ایلی کے ہم کارتے تھے۔ وہ ایک خاموش مزاج شخص تھے اور مدرسے میں اکثر ایلی سے ملا کرتے تھے۔ چپ چاپ ایلی کی باتیں سن کرتے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں کبھی ایک دوسرے سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔

پہلے دو ایک دن تو ایلی شیخ پر شک کرتا تھا۔ شاید یہ شخص ہمدرد بن کر ہمارا بھید لے رہا ہے۔

شاپید شریف کا جاموس ہو شاید۔ میکن دو دن کے بعد اس کے شکوک رفع ہو گئے اور شک اکنے لئے حمرا میں نخلتان بن گیا۔

شیخ کے بھائی نے ایلی کو مشورہ دیا کہ شہزاد پچھری میں جا کر حلفیہ بیان درج کروادے کہوہ اپنی مرضی سے گھر ملے آتی ہے اور اس کی پیشان بھلی وہ جائز ولی ہے اس کے ساتھ رہتی ہیں۔

پچھری کا نام سن کر ایلی کی روح نہ ہو گئی۔ شہزاد نہ پڑی۔ ”تو اس میں کیا مشکل ہے۔“ وہ بولی۔ ”اوکھی میں سردینے والے کیا دھمکیاں سے ڈرتے ہیں۔“ اگلے روز ہی شہزاد نے شیخ کے گھر سے ایک بر قعہ منگوالیا اور وہ دونوں تانگے میں بیٹھ کر چل پڑے۔ وہ اپنا بر قعہ نہیں پہنانا چاہتی تھی تاکہ محلے والے اسے پہچان نہ لیں پچھری سے کچھ فاصلہ پر ایک پرانا مقبرہ تھا۔ شہزاد نے وہاں تانگہ روکا اور ایلی کو اتار دیا۔ بولی ”جب تک میں نہ لوٹوں یہاں سے نہ ہلن۔“ اور خود پچھری کی طرف چل پڑی۔

مقبرے کے اندر ایک سپاہی نے اسے لکا کر اے۔“ وہ بولا ”اہر آؤ۔“

”جی۔“ ایلی پاس جا کر بولا۔

”بھگوڑے ہوتم۔“

”جی۔“ ایلی نے گھبرا کر سچ کہہ دیا۔

”تم اس عورت کو بھگا کر لائے ہونا جو بھی تانگے سے تمہیں اتار کر گئی ہے۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

سپاہی نے قہقہہ مارا۔ بولا ”تم جھوٹ بولتے ہو معلوم ہوتا ہے تم نے اسے انہوں نہیں کیا۔ بلکہ وہ تمہیں انہوا کر کے لاتی ہے۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”ہمیشہ عورت ہی انہوا کر کے لاتی ہے۔ لیکن

محرم مردگر دانا جاتا ہے اور سزا مردگر ملتی ہے۔“

سپاہی نے پھر قہقہہ لگایا۔ بچ کہتے ہو میاں۔“

وہ سپاہی ایلی کا دوست بن گیا۔

”وہ اکیلی کچھری گئی ہے نا۔ بڑی جرات ہے اس میں۔“ سپاہی نے کہا۔

”ان سب میں بڑی جرات ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

شہزاد نے کچھری میں حلفیہ بیان درج کرایا۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو آصفی محلے کے ایک جھنے نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ شہزاد یہ دیکھ کر پھر سے محضیت کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ کہنے لگی۔

”مجھے ڈشناوں سے خطرہ ہے۔ میری حفاظت کا انظام کرو۔ مجھسیت نے دو سپاہی ساتھ کر دیئے۔ مقبرے پر جا کر دو تانگے سے اتر گئی۔

محلے والے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ وہ مقبرے میں آگئے۔ سپاہی نے باہر جا کر انکارستہ روک لیا۔ ”کے ڈھونڈ رہے ہو۔“ وہ بولا۔

”یہاں ایک عورت اتری تھی۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”وہ تو ادھر گئی ہے۔“ سپاہی نے سڑک کی وسیعی طرف اشارہ کیا اور وہ ادھر چلے گئے۔

”آ تو تمہیں گھر چھوڑ آؤ۔ سپاہی بولا۔“ یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔“

”ہم خود چلے جائیں گے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

”تو تو چلی جائے گی۔ لیکن یہ۔“ سپاہی نے ایلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”جسے تو ساتھ

لائی ہے۔“

”ایسون کو ہی ساتھ لایا کرتے ہیں۔ وہ بولی۔

ارم اپورہ

سپاہی نے قہقہہ لگایا۔ ”بھائی وہ کیا جوڑی ہے۔ وہ قہقہہ مار کر رہنے لگا۔

مہینہ بھروہ امرتسر میں رہے۔ ایلی باہر نکلتا تو اس کے منہ پر دھیوں کی سیاہ راکھ تھی ہوتی اور اس نے اپنے گرد ایک میبل لپٹا ہوتا۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے کئی بار اس نے محلے والوں کے گروہ دیکھتے اور ڈر کی وجہ سے اس کا دل اچھل کر گئے میں آٹکا تھا۔ چار ایک باروہ پکھری بھی گئے تھے لیکن حسب وہ متور ایلی کو شہزادے مقبرے میں چھپا دیا تھا۔

جب ایلی گھر آتا تو کوئی نقشہ ہی بدال جاتا۔ وہاں پہنچ کر وہ محسوس کرتا جیسے وہ پکنک پر آئے ہوں اور انگلی زندگی میں خطرے یا مشکل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

سارا دن وہ بیٹھ کر تاش کھیلتے اور جو ہارتا اسے چور بناتے۔ اس کے لئے انوکھی سزا میں تجویز کرتے اور پھر قہقہہ لگاتے۔ اڑکیاں ناق ناق کر چلتیں بات بات پر ہنستیں۔ مل کر گیت گلگنا تیں۔ بچے تالیاں بجاتے وہ سب قطعی طور پر اس خطرے سے بے نیاز تھے۔ جوان کے سر منڈل اڑھا تھا اور شریف کے ساتھیوں نے سار امرتسر چھان مارا۔ لیکن انہیں ایلی اور شہزادے کے چھینے کی جگہ کا علم نہ ہوا۔ کاشی شیخ نے ہر ممکن طریق سے ان کی مدد کی۔ ان کے بھائی نے انہیں قانونی مشورے دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریف کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ اور پھر سے اس پر قتوطیت چھا گئی جو اس کی طبیعت کا بنا دی جزو تھی اور ایک روز وہ چپکے سے روپوش ہو گیا۔ اس پر محلے والے بگڑ گئے۔

انہیں یہ شکایت تھی کہ جب خود شریف میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کہاں اس کی خاطر دنیا بھر کی دشمنی مول لیں۔ اس لئے وہ بھی میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

محلے والوں نے ڈیرا اخباروں میں جو خوبیریں ایلی کے متعلق چھپوائی تھیں۔ انہیں

دیکھ کرو ہیچارا خود ڈر گیا تھا۔ سکول کو بدنا می سے بچانے کیلئے اس نے کوشش کر کے ایلی کا تبادلہ کرا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس لمبی رخصت کے دوران ایلی ڈیرہ سے ارم پورہ تبدیل ہو گیا۔ یہ تبادلہ ایلی کے لئے نعمت غیر متربھی۔

ارم پورہ بنیادی طور پر لا ہور کے قریب ایک قصبه تھا۔ لیکن شہر کے پھیلاوہ کی وجہ سے اب وہ لا ہور کی بستی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگر وہ ڈیرہ ہی میں مقیم رہتے تو ایلی اپنے مکان کو خنیہ نہ کہ سکتا۔ لیکن لا ہور میں اپنے مکان کیا جائے قوع کو صیغہ راز میں رکھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اسی وجہ سے ایک ماہ کی رخصت کے بعد ایلی انگری پر حاضر ہو گیا۔ اس نے ایسی جگہ مکان کرایہ پر لیا جو لا ہور کی ایک اور بستی تھی اور ارم پورہ کی متقادیت میں واقع تھی۔

اگرچہ طوفان گزر چکا تھا پھر بھی لکیرا بھی تازہ تھی۔ ایلی ڈرتا تھا کہ نہ جانے کب طوفان پھر سے چلنے لگے۔ اس لئے وہ بے حد محتاط تھا۔ اس کی یہ احتیاط اور اک کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈر کی وجہ سے تھی۔ وہ بنیادی طور پر بے حد بزدل واقع ہوا تھا۔

وہ سب مقدمات جو شریف نے ان کے خلاف دائر کر کے تھے۔ عدم پیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو چکے تھے۔ لیکن مجھے میں ایلی کی بے حد بدنا می ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ افسر اعلیٰ معروف صاحب نے ایلی کے والد کو خط لکھ کر منذہ کر دیا تھا کہ ان حالات کے تحت وہ ایلی کی امد اور کرنے سے قاصر ہیں۔

جب وہ پہلے روز ارم پور کے مدرسے میں حاضر ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے چارج دینے سے انکار کر دیا۔ بو لے ”ہم نے آپ کا کیس ڈائر کٹر بہادر کو بھیج دیا ہے۔ جب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کریں ہم آپ کو چارج نہیں دے سکتے۔“

چار ایک روز کے بعد ہیڈ ماسٹر نے ایلی کو بتایا کہ مسٹر معروف نے اسے انڑو یوکے لئے بلا یا ہے لہذا اسے بڑے دفتر میں جانا چاہیے۔

مستر معروف سے ایلی کا وہ دوسرا انٹرو یو تھا۔ چند ایک سال قبل جاورا میں وہ انکوارری کرنے آئے تھے اور ایلی اور مستر معروف کے دیکھ کر محسوس کرتا تھا جیسے اس کے روپ و ایک خوش نداق رنگی عورت بیٹھی ہو۔ اس کے دل میں ذرہ بھر خوف پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”کیا یہ سچ ہے آپ کے خلاف اخباروں میں خبر یہ نکلی ہیں؟“ معروف بولے۔

”جی مجھے نہیں علم۔“

”کیا آپ نے لذت بخشی و نوون میں اخبار نہیں دیکھے؟“

”جی نہیں۔“

”کیوں۔“

”جی میں چھٹی پر تھا۔“

”آپ نے کس لئے چھٹی لی تھی؟“

”جی تفریح کے لئے۔“

”تو آپ نے کیسے تفریح کی؟“

”گھر بیٹھا رہا۔ منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کوئی کام نہیں کیا تاش کھیلتا رہا۔“

”ہوں۔“ وہ بولے ”تاش کا کون سا کھیل کھیلتے رہے؟“

”جی چوسپا آہی۔“

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی۔ لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا۔

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پر اغوا کا الزام ہے۔“

”جی مجھے نہیں معلوم۔“ وہ بولا۔

”ہم جو آپ کو بتا رہے ہیں۔“ وہ غصے میں بولے۔

”کسی عدالت نے مجھے بتایا۔ بہر حال۔“

”تو آپ کو کوئی سمن نہیں ملا۔“

”جی نہیں۔“

”آپ کچھری میں حاضر نہیں ہوئے۔“

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو وہ خبر میں کیوں پھیپھیں۔“

”جی مجھے معلوم نہیں۔“

”آپ کو علم ہونا چاہیے الیاس صاحب کو اس خاتون سے شوہرنے مجھے سب باقیں لکھی ہیں۔“

”ممکن ہے۔“ وہ ابوالماجد سے کہا۔

”کیا آپ نے اس کی بیوی کو انہوں نیا ہے۔ وہ بھتی میں بولے۔“

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ میرے رو برو جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر کوائف کیا ہیں؟ سچ مجھ بتائیں ورنہ میں سخت کارروائی کروں گا۔“

”جی حقیقت یہ ہے کہ اس کی بیوی نے مجھے انہوں نیا کیا ہے۔“

معروف صاحب کی تلسی نکل گئی۔

”آپ عجیب؟ آدمی ہیں۔“ وہ بولے۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ میں ایک عام آدمی ہوں۔“

”لیکن آپ ابھی کہہ رہے تھے۔ معروف صاحب پھر سمجھیدہ ہو گئے۔“ کہ آپ چھینیوں میں تاش کھلتے رہے۔“

”سچ عرض کیا ہے میں نے۔“

”کس سے تاش کھلتے رہے۔“

”جی ان سے جنہوں نے مجھے انہوں کیا ہے۔“

”وہ کون کون ہیں۔“

”جی چھپے اور ان کی ماں۔“

”تو کیا یہ ہے کہ وہ چھپوں کی ماں ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آپ عجیب بے قوف ہیں۔ اگر انہی کرنا تھا تو کسی لڑکی کو کرتے خواہ مخواہ آپ نے اتنے بڑی کنبے کا بوجھا اٹھالیا۔“

”جی کوئی لڑکی مجھے انہوں کرنے کو تیار نہ تھی۔ تو اسے اس چھپوں کی ماں کے۔“

”شہ اپ۔“ معروف غم غمے نہم نہاں سے بولے۔ ”جا کر چارچوں پنجھے اور یاد رکھیے۔ اگر پھر آپ کی روپورت آئی تو آپ کو سیندھ کر دوں گا۔“

معروف کے بعد ارم پورے کے ہیڈ ماسٹر راغب صاحب نے سے اپنے فنٹر میں بلا لیا۔ راغب صاحب ایک دبلے پتلے جلے کئے آدمی تھے۔ ان کا چہرہ لمبا تھا مگر کتابی نہیں تھا۔ آنکھیں اندر کو ہنسی ہوئی تھیں ناک بیوں ابھری ہوئی تھیں جیسے سمندر سے موئیں کی چٹان جھائک رہی ہو۔ ایلی نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ معروف سے بر عکس قسم کی شخصیت تھے۔

”آصفی صاحب“ وہ بولے ”اگر چہ معروف صاحب نے آپ کو اجازت دیدی ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے سکول میں کام کریں۔“

”معروف صاحب نے مجھے اجازت نہیں دی۔ ایلی نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بولے۔

”معروف صاحب نے فرمایا ہے کہ راغب صاحب کی مرضی کے بغیر ہم کچھ نہیں کریں گے۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن“ وہ رک گئے۔ ”اچھا مجھے اس کا علم نہ تھا۔“

”معروف صاحب نے صاف کہہ دیا تھا۔ ایلی نے کہا۔ میں اجازت دینے والا
کون ہوں کام راغب صاحب نے لیتا ہے۔“

”خوب خوب۔“ وہ خوشی سے چلائے۔ تو ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ
میں کام نہیں کریں گے۔“

”جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔ ایلی نے کہا۔

”دیکھنے تا ہم بدنام آدمی کو اپنے سکول میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم اپنا ڈپلٹ خراب
نہیں کریں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی لیکن راغب صاحب بدنام آدمی ڈپلٹ خراب نہیں کر سکتا۔“

”آپ کا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ شراست وہ لوگ کرتے ہیں جن پر شبہ نہ کیا جاسکے۔ یا جن کا
اعمال نامہ صاف ہوا اور ان پر حرف نہ آ سکے۔ بدنام آدمی تو اپنا جائز تحفظ بھی نہیں کر
سکتا۔ وہ تو کانچ کے گلاس کی طرح ہوتا ہے۔ ذرا ضرب لگی اور ٹوٹ گیا۔“

”کیا آپ مجھے عقل سکھانے آئے ہیں۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا مجھ میں تو خود عقل نہیں میں کیا عقل سکھاؤں گا کسی کو۔“

”کیا مطلب۔“ وہ چلائے۔

”جی عقل ہوتی تو کیاچھ بچوں کی والدہ کو انہوں کرلاتا۔“

”تو کیا یہی ہے؟“ وہ بولے۔

”ہاں جی اور یہی میری بے قوفی دلیل ہے۔“

راغب صاحب بول کھلا گئے۔

اگلے روز راغب صاحب نے معروف صاحب سے احکامات کی وضاحت کی
و رخواست کرتے ہوئے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کہ الیاس آصفی کے بیان کیمطابق
انہیں اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا ارم پورہ کے سکول میں

الیاس کام کرتے ہیں یا نہیں۔

معروف فورا بھانپ گئے کہ وہ بات جو انہیں کہنی چاہیے تھی۔ ایلی نے از خود را غب سے کہہ دی ہے۔ اس بات پر وہ بے حد مسرو رہئے اور بولے۔ یہ ٹھیک ہے راغب لیکن ہمارا مشورہ ہے کہ آپ الیاس کو اپنے پاس رکھنے پر رضامندی دے دیں وہ ایک قابل شخص ہے۔ آپ کو کام سے تعلق ہے نا عورتوں کے اغوا سے تو نہیں۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی نے ادم پورہ میں کام شروع کر دیا۔
جھوٹ بچ۔

ایلی نے زندگی میں نئی بات لیکھی تھی۔ وہ بچ کے زیر یعنی جھوٹ بولتا تھا۔ اسے تجزیہ کے زور پر اس حقیقت کو پا لیا تھا کہ پچی بات کہہ دکی جائے تو سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اسکے دل میں نفرت کی بجائی دل چھپی اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور کبھی کھارا خڑا مبھی۔ اس کے علاوہ کہنے والے کے دل پر بو جنہیں رہتا۔ اور بات کہہ دی جائے تو ہو پھوڑ انہیں بختی۔ اس میں پیپ نہیں پڑتی۔ اکثر اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ پچی بات کو اعلانیہ تسلیم کر جائے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ مذاق کر رہا ہے انہیں یقین ہی نہیں آتا۔ شاید ایلی نے یہ انوکھا طریقہ شہزادے سے سیکھا ہو۔

بہر صورت جب اسامدہ اس سے ملے تو اخباری خبروں کی بات چھڑ گئی۔ ایک صاحب اخلاقا بولے۔ جی ان اخبارو والوں کا کیا ہے۔ جو جی چاہتا ہے ان اپ شناپ لکھ دیتے ہیں۔ بچ ٹھوڑے ہی لکھتے ہیں۔ ”کیوں الیاس صاحب۔“
”اپنا تجربہ تو مختلف ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ایک اور صاحب بولے۔

”مطلب یہ ہے کہ میرے متعلق آج تک صرف ایک خبر چھاپی ہے انہوں نے اور وہ سولہ آنے پچی ہے۔“

”اے۔“ وہ چلائے، ”کیا واقعی؟“

”تو کیا جو خبریں آپ کے متعلق چھپی تھیں وہ درست ہیں۔“ ایک صاحب نے پوچھا۔

”بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔
وہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کہیں وہ ایک مسکراہر ہے تھے۔ دو ایک قسمیں بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”تو آپ نے چھپجوں کی ماں کو اخواکر لیا۔“ ایک نے پوچھا۔

”بھی نہیں۔“ وہ بولا۔

”ہائی۔ ابھی تو کہہ رہے تھے
”خبر تو سچی ہے مگر انداز بیان میں سچھ غلطی رہ گئی ہے۔“ ایلی نے کہا۔
”کیا؟“

”یہ کہ چھپجوں کی ماں نے مجھے اخواکر لیا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہی ہی ہی ہی۔“ ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی بات پر لوگ قہقہہ مار کر نہ لیں تو بات اپنی سنگینی کھو دیتی ہے۔ اس لئے اس نے اس موضوع پر ایک پیچر دینا شروع کر دیا کہنے لگا ”بھائی مردوں کی قوم پر عورتوں کی قوم ہمیشہ ظلم کرتی آتی ہے۔ وہ ہمیشہ مردوں کو اخواکرتی رہیں اور نام بدنام ہوتا رہا ہے۔ مرد کو مجرم گردانا جاتا رہا۔ مرد جیل جاتا رہا مرد قید کا ثما رہا مرد معلوم ہوتا ہے۔ تعزیریات ہند کی اخواء کی دفعہ لکھتے وقت مصنف کی بیوی بھی پاس بیٹھی تھی۔ اس ظالم نے ساری دفعہ ہی غلط لکھوا دی۔“

مرد اور عورت کی بات کرتے وقت ایلی یوں محسوس کیا کرتا تھا۔ جیسے لبخ خشکی سے اتر کر پانی میں جا پہنچی ہو۔

پہلے روز ہی جملہ ساتھ کو ایلی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور وہ اس کے دوست بن گئے۔ جب بھی تفریح کی گھنٹی بجتی اور ایلی کو لے کر کسی مقام پر جا بیٹھتے اور اسے چھیڑ کر اس کی باتیں سننے۔ لڑکے دور دور سے اسے دیکھتے اور مسکراتے اور ہیڈ ماشر اسے معروف کا آدمی سمجھ کر اس نے اخلاق اپنے پیش آتے۔

آٹھ بچے

سکول میں ہیر وہن کو گھومنے کے بعد وہ سائیکل اٹھا کر چوروں کی طرح گھر کی طرف چل پڑتا جان پوچھ کر لمبے راستے سے گھر جاتا تاکہ کوئی یہ سمجھ لے کروہ رہتا کہاں ہے کوئی اس کے گھر کا پتہ پوچھتا تو صاف کہہ دیتا۔ ”بھائی گھر کا پتہ نہ پوچھوا اور کوئی خدمت بتاؤ جو انہوں نہیں تھیں وہ گھر کا پتہ صحیح راز میں رکھتے ہیں۔“
گھر پہنچتا تو وہ گھر کے ہنگامے میں ٹھوک جاتا۔

گھر میں وہ آٹھ بچے تھے۔ کبھی کسی نے محسوس نہیں کیا تھا میں کوئی بڑا بھی ہے۔ بڑا گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ ماں کیا بڑی بہن سکتی ہے۔ جو چھ ساتھ لے کر گھر سے بھاگ آئی ہو۔ وہ مرد کیا بڑی این سکتا ہے۔ جو چھ بچوں کی ماں کو انہوں نے کر لایا ہو۔ ان حالات میں جو تھوڑی بہت بزرگی اور بڑائی شہزاد اور ایلی میں تھی۔ وہ بھی خارج ہو چکی تھی۔ کس منہ سے وہ عقل و ادراک اخلاق یا سنجیدگی کا ڈھونگ رچاتے اور پھر ان بچوں کے روپ و جو جوان تھیں۔ صحیح تیرہ سالکی تھی۔ نفیسہ بارہ کی اور رسیحانہ نو سال کیا البتہ ایک بات ضرور تھی۔ شہزاد اور ایلی نے کبھی بڑائی ہاتھ سے جانے پر فسوس نہ محسوس کیا تھا۔

اگر شہزاد کبھی کبھار لڑکیوں کے شور سے نگ آ جاتی اور چلا کر کہتی ”امی“ لڑکیوں سنتی ہو۔

”امی۔“ نفیسہ ہستی ”ورا زور سے بول لو تو کچھ سنائی بھی دے۔“

”کانوں میں قیل ڈالا ہوا ہے کیا؟“

”تیل تو نہیں۔“ صبیحہ کہتی۔ ”کانوں پر صرف بال ڈالے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”دل تو اچھا ہے نامی۔“ وہ تپکھہ مار کر ٹھیک نہیں۔

پھر وہ سب جھرمٹ ڈال ایسی کے گرد آکھڑی ہوتیں اور ناچھیں گاتیں ٹھیک نہیں۔ ایسی کہتا۔

”شورنہ مجاو۔ گروکسی کو ہمارے کھر کا پتہ حل گیا تو۔“

”تو کیا۔ وہ جواب دیتیں۔ یہی ناکہ وہ چھپی لکھ دے گا ہمیں اور چھپی رسائیں چھپیں گے۔“

”اور اگر کسی نے آکر تمہیں چوٹی سے پکڑایا تو۔“ ایسی چلاتا۔

”تو چوٹی کاٹ ڈالیں گے۔“ وہ تپکھہ مار کر نہیں پڑتیں۔

ان کی زندگی میں ایک مشکل تھی۔ جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ایسی کی تخلوہ اصرف سنتا لیس روپے تھی۔ ایسی اس زمانے میں جوان ہوا تھا۔ جب پہلی عالمی جنگ کے اثرات رونما ہوئے تھے اور دنیا بھر میں مالی بحران کا دور دوڑہ تھا۔ بنیادی طور پر ایک ٹرینڈگری بجوبیٹ کا گریڈ اسی روپے سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن مالی بحران کی وجہ سے گورنمنٹ کے ملازم میں کی تخلوہ ہوں میں تخفیف کر دی گئی تھی اور اسی کی وجہ اب پیشی بھر روپے ایم اے بی ٹی کو دیئے جائیں۔ اس لئے ایسی کی تخلوہ پینتا لیس روپے سے شروع ہوئی تھی۔ اور اب وہ سنتا لیس روپے پار ہا تھا۔ سنتا لیس روپے اتنے بڑے کنبے کے لئے بے حد ناکافی تھے۔ خصوصاً ایک ایسا کنبہ جو مالی مشکلات کے تصور سے ہی بے گانہ تھا۔

ان کے پاس جو آٹا شکاوہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ شدت سے مالی مشکلات کو محسوس کرنے لگے تھے۔ اس امر کو صرف ایسی ہی محسوس کرتا تھا۔ لڑکیاں اس بات سے بے نیاز واقع ہوئی تھیں۔ روایتی ملکہ کی طرح وہ سوچتی تھیں کہ غریبوں کو اگر

کھانے کو روئی نہیں ملتی تو وہ کیل پیش ری کیوں نہیں کھاتے۔

بہر حال یہ امر مسلمہ تھا کہ اگر مالی مشکلات کا احساس ان کے گھر میں صد دروازہ سے داخل نہ ہوا تھا۔ تو عقیقی دروازے سے ضرور داخل ہو رہا تھا۔ لا شوری طور پر جانے بغیر ان کی زندگی میں ان جانی تلخی بڑھنے لگی تھی۔

”ڈول ہان“

لا ہور میں صرف ایک آدمی تھا۔ جوان کے مکان سے واقف تھا۔ وہ تھا محمود بھی کھار محمود آنکھتا اور ایلی کومیم کی بائیں سناتا اور کانج کے قصے بیان کرتا۔ محمود ستر ہواں لے پالک ہونے کے باوجود گھر میں بیویں رہتا تھا۔ جیسے الف لیلی میں شہرا دیوں کے جھرمٹ میں سلطان رہتے۔ انکے تالی بجائے پر جنگی جلا و ہاتھ میں تکوار اٹھائے حاضر ہو جاتا۔ لیکن کبھی کھار ایلی کوشک پڑتا کہ محمود میں بھی ایک ایلی چھپا ہو ائے۔ جو مامتا بھری گود میں لیٹنے کے لئے بلکتا ہے۔ جسے یہ آرزو ہے کوئی اس کی دیکھ بھال کریں۔ اس کی ناک پوچھے منہ دھونے اور پھر پیار سے جھڑک کر سکوں بھیج دے ایلی جذباتی طور پر ڈر جاؤ پچھہ تھا اور ڈنی طور پر ایک مذر مغلک۔

ایک روز وہ سب بیٹھے تھے تو محمود آگیا۔ اس کے ساتھ ساری میں لپٹی ہوئی ایک گوری چٹی عورت تھی۔ جسے اس نے اندر بھجوادیا۔

”اُرے یہ کون ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ بھی ہے۔“ محمود بولا۔

”کوئی نئی پھنسی ہے؟“

پھنستی ہی رہتی ہیں۔ اب ایک کام کرو۔“ محمود بولا۔

”کیا؟“

”ایک مولوی یا لوادو۔“

”بھی نکاح پڑھوانا ہے۔“

”اور وہ میم کیا ہوئی؟“

ایلی ادھر ادھر بھاگ دوڑ کر ایک مولوی لے آیا۔

مولوی صاحب پہلے تو محمود کو کلمے پڑھاتے رہے۔ پھر جب ایجاد و قبول کا وقت آیا تو مولوی صاحب نے کہا۔ ”کیا آپ کو محمود ولد احمد سکنہ رام پور کی زوجیت میں آنا قبول ہے؟“

وہ خاتون بولی ”ہام کو منجور ہے۔“

اس پر لڑکیاں منے لگیں۔ ایلی نے حیرت سے خاتون کی طرف دیکھا۔ اور یہ آپ تو میم ہیں۔ ”وہ بولا۔“

میم نے کہا ”ہام“ ”ڈول بان“ ہے میم نہیں۔“

مولوی کی جانے کے بعد ایلی کے گھر میں ہنگامہ مج گیا۔ لڑکیاں میم کے سہاگ گانے لگیں۔ اسے چھیرنے لگیں۔ میم نہے جا رہی تھی۔ محمود مسکرا رہا تھا۔ شہزادی آنکھوں میں مسرت کی پھوہار پڑ رہی تھی۔

محمود اور میم کے لکھ کے چند روز بعد محمود بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی۔“
”وہ بولا“ ”وہ نہیں آئی!“

”کون نہیں آئی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”آج ویک اندھہ ہے۔“ ”وہ بولا“ ہرو یک اندھہ پر وہ آیا کرتی ہے۔ بلانا غد لیکن اب کی بار نہیں آئی۔“

ایلی نے قہقهہ لگایا ”تم تو پا گل ہو۔“ ”وہ بولا“ ”خواہ مخواہ پر یشان ہو رہے ہو جیسے وہ پچھی ہو۔“

”تم نہیں جانتے۔“ ”وہ ہنسنے لگا۔“ ”واقعی وہ پچھی ہے۔“
”پچھی ہے۔“ ایلی ہنسا۔

”ہاں۔“ محمود نے کہا یہ سب بچیاں ہوتی ہیں۔ ان کی عمر نہ دیکھو شکل نہ دیکھو

صورت نہ دیکھو۔ یہ سب بچیاں ہوتی ہیں اور جبھی تک ٹھیک رہتی ہیں جب تک ان پر پچی حاوی رہے۔“

”لیکن گھبرائے کیا بات ہے۔“ ایلی بولا ”گھرانے کی بات تو ہے۔“ محمود نے کہا ”وہ آئی جو نہیں۔“

”مجھے سمجھ میں نہیں آئی بات۔“

ڈارٹکشیں

”مجھے بھی نہیں آئی نا۔“ محمود نے کہا ”میراں کہہ رہا ہے کہ معاملہ لڑڑ ہے۔“
دروز محمود نیم کا احتفال کرتا رہا لیکن وہ نہ آئی۔ وہ پھر وہ نے پھر چلا گیا۔ وہاں جا کر
انپا آپ ظاہر کے بغیر اس نے حالات کا جائزہ لیا معلوم ہوا کہ وہاں موجود نہیں۔
اس پر وہ گھبرا گیا۔

مزید پوچھ گئے پر اسے معلوم ہوا کہ ایک صاحب اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس
کے علاوہ اسے کچھ علم نہ ہو سکا۔

لاہور والپس آ کروہ سیدھا ایلی کے پاس آیا۔ غصب ہو گیا۔ ”وہ بولا۔“ ”وہ شی شہر
میں بھی نہیں ہے۔ کہتے ہیں کوئی گورا صاحب اسے آ کر لے گیا ہے۔“

”کیا زبردستی لے گیا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بھی۔ وہ بولا اسے کوئی زبردستی لے جائے تو اس کے لئے اس بڑھ کر رہیں
کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ سمجھی ایسی ہوتی ہیں۔ پہلے روئی ہیں۔ چھپتی ہیں چلاتی ہیں پھر غم
سے مٹھاں ہو کر لے جانے والے سے چھٹ جاتی ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”محمود خاموش رہا۔“ ”کیا میموں کی بات کر رہے ہو۔“ ایلی نے پھر پوچھا۔

”اونہوں“ ”وہ بولا“ ”عورت ہمیشہ عورت رہتی ہے۔ چاہے وہ نیم ہو دیسی ہو یا جہش
ہو۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

محمود کی بات صحیح نکلی چند ہی دنوں کے بعد اسے ایک خط موصول ہوا جس میں درج تھا۔

”مجھے اپنی سے معلوم ہے کہ تم غنڈوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہو اور تم نے ایک برٹش نیشنل خاتون کو عرصہ دراز سے غوا کر رکھا ہی اور تم نے اسے زبردستی مسلمان کرنے کی قبیلگوش کی ہے اور وہو کے سے اس کے ساتھ عقد کیا ہے۔ حالانکہ تعزیرات ہندوستان کے تحت کوئی ہندوستانی کسی برٹش نیشنل خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک خاص اجازت نامہ حاصل نہ کرے لہذا تم اور تمہارے دوست وہو کہ دہی اور غواہ کے مرتب ہوئے ہو اور تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی سے گرین ٹکس کروں گا اور تم نے اس خاتون سے دوبارہ ملنے کی سعی کی تو اپنے اختیارات کو کام میں لا کر میں تمہیں یہ فرمادیں کہ تمہارے پہنچاؤں کا۔

خط کے نیچے لمبے چوڑے و سخت کے ہوئے تھے۔ نیچے لکھا تھا کمشنر بجا پور۔
”ارے۔“ ایلی چلایا۔ ”وہ تو کوئی کمشنر ہے۔“

”یہی مصیبت ہے۔“ ”محمود بولا۔“ وہ اسے غوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کی مدت سے آرزو تھی کہ کوئی اسے زبردستی غوا کر کے لے جائے پھر جب تم ان سب کو لے آئے اور اس نے یہ قصہ سناتو گویا جلتی پر تیل پڑ گیا وہ بھی بھڑک اٹھی۔ اس کی یہ خواہش اور بھی محلی اور ارباب، اب یہ ڈارکنیں نہ جانے اسے کہاں سے مل گیا ہے۔“
محمود سخت گھبرا یا ہوا تھا۔

محمود کے کہنے پر ایلی بے جا پور گیا تاکہ وہاں سے کوائف حاصل کرے۔ پہلے تو وہ شہر کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ پھر س نے کمشنر کی کوٹھی کا پتہ لگایا اور وہاں پہنچ کر باہر انتظار کرتا رہا کہ کب کمشنر دفتر جائے تو کوٹھی کے کسی نوکر سے ملے آخر کمشنر کی کار کوٹھی سے باہر نکلی۔ کچھ دیرا انتظار کرنے کے بعد وہ کوٹھی کے آؤٹ ہاؤس کی طرف گیا اور چوکیدار کو پانچ روپے تھا دیئے۔ ”بابا صاحب کس قسم کا آدمی

ہے؟"

"تو بہے، بابا نے جواب دیا۔" یہ صاحب تو سمجھ کر لو آفت ہے آفت۔"

"کیا سخت مزاج ہے۔"

"اونہوں بابا یہ تو بد ہے بد۔ سارا دن بینجھ کر شراب پیتا ہے۔ سارا دن۔"

"کیا عمر ہو گی؟"

"بوڑھا ہے۔ لیکن سخت زانی ہے شرابی بھی۔"

"ایک بات بتاؤں بابا۔" ایلی نے کہا اور پھر قدرتے تو قفت کے بعد اس نے چوکیدار سے کہا۔

"تمہارا صاحب ایک مسلمان عورت کو بھاگالا یا ہے۔ بنے شہر سے۔"

"نہ بابو۔ وہ بولا۔" یہاں اپنی دیگی عورت کبھی نہیں آئی یہاں تو میمیں آتی ہیں۔

جو ان بوڑھی اوہیڑ سمجھی آتی ہیں۔

"لیکن بابا۔" ایلی نے کہا "وہ ہے تو میم مگر مسلمان میم ہے۔"

"بابا قہقہہ مار کر رہا۔"

"صح کہتا ہوں بابا۔" ایلی نے کہا۔

"نہ بھی۔" وہ بولا "میم مسلمان نہیں ہوتی۔ ان میموں کا اسلام سے کیا واسطہ۔"

ایلی نے بابا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں میم کا مسلمان ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ اسلئے ایلی کی تجویز نا کام ہو گئی۔

"اچھا۔" وہ بولا "بابا یک کام تو کرو مجھے اس میم کے سامنے لے چلو۔ جو اس وقت صاحب کے گھر میں ہے۔"

"اونہوں۔" بابا نے جواب دیا۔ "گھر میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔"

"تو چلو بہر سے جھانکوں گا۔"

بابا کو یہ بات بھی منظور نہ تھی۔ بولا "نہ بابو وہ دیکھ لے یا اسے پتہ چل جائے تو کھا

جائے گا۔

”ایسا سخت ہے ہو۔“

بہر حال ایلی نے کوٹھی کے باہر دو ایک چکر لگائے کوٹھی چاروں طرف سے بندھی۔
اس نے کھڑکیوں کے شیشوں پر جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر دیزپر دے لٹک
رہے تھے۔

ابھی وہ ہیں کھڑا تھا کہ خانہ مال کا لڑکا آجیا۔

وہ ایلی کو گھورنے لگا۔

ایلی نے اس سے پوچھا ”کوٹھی میں کوئی ہے گیا؟“

”غیر میں بایو۔ وہ ابو لا صاحب اسکیلے ہی رہتے ہیں۔“

”کوئی مہمان حورت تو غیر میں آئی ہوں گی؟“

”غیر میں۔“ وہ ابو لا۔

”جھوٹ نہ بولو۔“ ایلی نے کہا۔ مجھے معلوم ہے۔“

”ہاں۔“ لڑکے نے اقبال کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ پروہ بند ہے۔“

”بند ہے۔“ ایلی بولا۔

”ہاں۔“ لڑکے نے ڈرتے ہوئے اوہرا دھر دیکھ کر کہا ”صاحب تالہ لگا کر جاتا
ہے۔“

ابھی وہ بات ہی کر رہے تھے کہ موڑ کے آنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب بھاگ
کر آؤٹ ہاؤس کی طرف چلے گئے۔ تاکہ صاحب انہیں دیکھنے لے۔ ایلی نے دور
سے چھپ کر دیکھا۔ ڈار ٹانکنیں اوہیر عمر ختم کر چکا تھا۔ اس کا جسم بھدا تھا۔ چہرے پر
شراب نوشی کے واضح آثار تھے اور اس کے ساتھ ہی جابر انہ رجیانات متربع ہو رہے
تھے۔ اس کی شکل و صورت ان فلمی غنڈوں کی سی تھی۔ جو ہیر و مین کو اٹھا کر لے آتے
ہیں اور اسے قلعہ کے زیرین کمرے میں مغلبل کر دیتے ہیں۔

محمود نے جب یہ سنا تو اس نے سر پھیٹ لیا۔ ”بس کمچھ لو قصہ ختم ہو گیا اسے تو دریے سے یہ خواہش تھی کہ کوئی ظالم قسم کا جابر آدمی اسے پکڑ کر لے جائے اور کسی قلعہ میں قید کروے۔“ محمود کی بات صحیح ثابت ہوئی۔ میم نے اسے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ممکن ہے اسے کوشش کرنے کا موقعہ ہی نہ ملا ہو۔ وہ لمبی رخصت پر رہی اس لئے نئے شہر واپس نہ آئی۔ بلکہ وہیں سے ڈار گلشن نے اپنی قلم سے درخواست بھیج دی جس میں تحریر تھا کہ مسٹر فلپ (سابقہ) کو ریٹائر کر دیا جائے اور جو جو قوم اسے واجب الادا ہیں ان کی تفصیل بھیج دی جائے۔

مسٹر ڈار گلشن خود پیش نہ پا رہا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ گے اندر راندر وہ دونوں ہندوستان چھوڑ کر ساوتھ افریقہ چلے گئے اور ستر ہوائی لے پالک لا ہو رہیں بے میں بیٹھا حالات کا منہ سکتا رہا۔

لذت مظلومیت

شاید اس لئے کہ وہ اسم باسے تھا یا یہی شریف ایک مظلوم شخص تھا۔ اس نے فطرت ایسا عادت ہے اپنی تمام تراہیت کا انحصار اپنی مظلومیت پر استوار کر رکھا تھا۔ پہلے وہ انور کے عشق میں سرشار تھا۔ اس حد تک سرشار تھا کہ شہزادی رنگیلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی مظلومیت کی لذت میں کھویا رہا۔ یہ کہنا کہ اسے شہزاد سے محبت نہ تھی غلط ہو گا۔ اسے واقعی شہزاد سے محبت تھی۔ اسے شہزاد پر ناز تھا۔ وہ اس کی رنگینی سے کما حق واقف تھا۔ وہ شہزاد کے لئے بھی کچھ کرنے کو تیار تھا۔ لیکن مظلومیت کے احساس کو روشنہ کر سکتا تھا یہ احساس اس کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا۔ سال با سال کے عشق نے اسے اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ اب وہ تفریح اپنی مظلومیت اور ناکام عشق کا پر چار کرتا تھا۔ اسے خیال نہ آیا تھا کہ ایک رنگیں بیوی کی موجودگی میں کسی اور عورت کے عشق میں آہیں بھرنا اچھے نہ تھے پیدا نہیں کرتا۔

شریف کو یقین تھا کہ خود شہزاد اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ چونکہ اسے تھیلی کے

مینڈک کی بات نہ بھولی تھی۔

بہر صورت انور کے عشق کی ناکامی تو اس کے لیے ایک رنگین غم تھا جو نکلہ اذلی طور پر شریف ایک سچا اور خالص عاشق نہ تھا۔ بلکہ ایک سچے عاشق کی طرح بھر پسند واقع ہوا تھا۔ انور سے محروم ہو جانے پر اسے صدمہ تو ضرور ہوا — مگر وہ صدمہ ایسے ہی تھا جیسے بخ کے لئے پانی کا طوفان ہوتا ہے۔

شہزاد اور بچوں کا اپنی مرضی سے شریف کے گھر سے نکل آنا شریف کے لیے ایک شدید صدمہ تھا۔ ایک الیسا صدمہ جسم میں رنگین کاعنصر نہ تھا۔ اس میں خفت اور رسوانی تھی۔ ایسی رسوانی جو عشق کی رسوانی سے قطعی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ لہذا اس پر ہسیریا کا دورہ پڑ گیا تھا۔ اور اس دورے کے بعد وہ اپنے آپ سے باہر نکل آیا تھا۔ اور محلے میں آ کر اس نے غیر از معمول آگ لگادی تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب ہسیریا کی شدت مدھم پڑ گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس روپ سے تو رسوانی اور بھگی بڑھ رہی تھی۔ اس کی بنیادی اتنا نے اسے للاکارا اور وہ چپ چاپ علی پور سے روانہ ہو گیا اور اپنی نوکری پر حاضر ہو گیا۔

اس صدمہ کی شدت کے ختم ہونے پر شریف نے محسوس کیا کہ وہ میٹھا میٹھا درود جو باقی رہ گیا تھا۔ اس کے لئے باعث تسلیم ہے۔ ایک غم خور کو گویا یا ہمیشہ کے لیے غم کی ایک دولت گراں مل گئی تھی۔

اس دولت کو پا کروہ اپنے پرانے کوئے میں گھس گیا اور اس نے اپنی طبیعت قتوطیت کا باؤہ اوڑھ لیا۔

غم خور کے لیے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسے ساتھی کی ہوتی ہے۔ جس سے اظہار غم کیا جاسکے اور اپنی محرومیت اور زمانے کے مظالم کا رونا رو یا جاسکے اس لئے شریف نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پرانی زندگی کو یکسر بھول جائے گا اور ایک نیا ورق الٹے گا۔ یہ نیا ورق ایک نئی شادی اور نئی بیوی تھی۔ لیکن ایسی بات اپنے منہ سے کہہ

دینا یا شعوری طور پر اس پر سوچنا ایک غم خور کے لیے ممکن نہ تھا۔ لہذا اس نے جلد ہی ایسے حالات پیدا کر لئے کہ اس کی ہمیشہ نے یہی تجویز بھائی کے سامنے پیش کر دی اس پر وہ حیرت سے بہن کا منہ تکنے لگا ”یہ تم کہہ رہی ہو جمیدی۔“ اس نے ملامت سے بہن کی طرف دیکھا اور مجبور ہو کر بہن کی بات مان لی شادی کے روزوہ بہت روایا جیسے اسے اپنی طبیعت کے خلاف کسی بات پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمیدی نے نیاز مر جو مرکی بڑی بیٹی رشیدہ بانو سے شریف کا بیان کروایا جو رشیدہ کے لواحقین کو یہ ذر تھا کہ کہیں شریف کی بیوی شہزادی اپنے چھ بالکوں کو لے کر پھر سے شریف کے گھر نہ آؤں ملے اس نے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شہزادی کو طلاق دے دو تو مناسب ہے۔ شریف اعلانیہ شہزادی کو طلاق دینے کے حق میں نہ تھا لہذا وہ چاہتا تھا کہ شہزادی قانونی طور پر آزاد نہ ہو سکے۔ اس نے اس نے چوری پوری طلاق نامے پر دستخط کر دیئے اور اس بات کی مخفی رکھا۔

شریف کے گھر ایک نئی بیوی آگئی۔ جس کے سامنے وہ صبح و شام اپنی مظلومیت کا قصہ بیان کر سکتا تھا۔ آہیں بھر سکتا تھا۔ چھت کو گلکلی باندھ کر دیکھ سکتا تھا گویا مینڈ ک کو پھر کچھ بھرا کنارہ مل گیا اور وہ پھر سے اپنے آشیاں میں آبیجا۔

محض اتفاق سے اس خفیہ طلاق کی خبرا میلی اور شہزادیک پہنچ گئی۔ اس روزوہ یوں محسوس کر رہے تھے۔ جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ جیسے وہ از سر نو عشق میں گرفتار ہو گئے ہوں۔ اگر چہ جہاں تک ظاہر کا تعلق تھا۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ یہ قانونی نقطہ ایک بے معنی بات ہے۔ وہ دونوں تو عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ بے حد خوش تھے اور ساتھ ہی اس خوشی کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

جب وہ دونوں ایک بوڑھے مولوی کے سامنے بیٹھے تو ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا _____ شہزاد پھر سے مونگیا گھوی بنی بیٹھی تھی۔ پھر جب وہ گھر واپس پہنچ تو

لڑکیوں نے ان کے گرد حرمٹ لگالیا۔ نفیسنا پنے لگی۔ صبیحہ گاری تھی۔ وہ سب مل کر انہیں چھیڑ رہے تھے۔ نگ کر رہے تھے۔ ان سے مذاق کر رہے تھے۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ اب وہ قطعی طور پر آزاد تھے۔ اب انہیں چھپ کر رہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ سکول میں لوگ بھول چکے تھے کہ ایسا کے متعلق اخبارات میں خبریں پھیلی تھیں۔ مسٹر معروف کو یہ امر یاد نہ رہا تھا کہ اسکے غلاف خطوط موصول ہوتے رہے تھے۔ محلہ والوں کے دلوں میں ان کے لئے نفرت رہی تھی ایک دو شریف کے رشتہ دار تھے جو ایلی کا نام سن کر تیوری چڑھانے یا نفرت سے من پھیر لیتے باقی لوگوں کو ان کے ساتھ کوئی عناد نہ رہا تھا۔

دواں وقت

پھر ایک روزان کے ہاں علی احمد آگئے۔ شہزاد کے آنے کے بعد یہ پہلا موقعہ تھا کہ علی احمد ان کے ہاں آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے شور مچا دیا۔ کیوں بھی شہزاد کوئی حق و قہ بھرو کوئی چائے والے پلاو۔ مہمان آئے ہیں۔ ایسا اور شہزاد علی احمد کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ ”میں نے کہا۔“ وہ بولے۔ ”جب تو ہم سے آنکھ بھی نہیں ملتی تھی۔ اب بولو۔“ شہزاد ہنسنے لگی۔

”اب نہستی ہے۔ جب دیکھ کر تیوری چڑھاتی تھیں۔“

”جب کی بات جب کے ساتھ۔“ وہ بولی۔ ”اب کی اب کے ساتھ۔“
”تو تم این وقت ہو۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا ”کہ جب اور اب کا خیال رکھتی ہو۔“

”آپ بھی تو ہیں این وقت۔“ وہ چلانے لگی۔

”وہ کس طرح۔“ علی احمد نے پوچھا۔

”جب آپ کی نگاہ اور ہوتی تھی اب اور ہے۔“

”ہی ہی ہی۔“ وہ بنے۔ ”تو تم نگاہ کو پہچانتی ہو۔ ہی ہی ہی۔ لیکن ہمارے

کمال کی بھی دادو نا بھی موقعہ اور محل سمجھتے ہیں کیا کہتی ہے۔“

پھر وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ باٹی باٹی۔“ وہ چلانے لگے۔ یہ تو سب جوان ہو گئی ہیں۔ عورت نے دنیا میں دھاندی مچارکھی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ شہزادی۔
”آج دیکھو تو پچھی ہوتی ہے کل دیکھو تو جوان اور پرسوں دیکھو تو ماں بن کر بیٹھی ہوتی ہے۔ عورت ذات تو ہاتھ پر سوں ہے ادھر کھی ادھر اگی۔ کیا کہتا ہے۔ اب تو بھائی اپنا آپ بھول جاؤ اور ان کا فکر کرو کیوں شہزادیکن شہزادگہاں اپنا آپ بھولتی ہے۔ اب بھی آئینے سے سامنے کھڑی ہو جاؤ تو یہم۔۔۔ کیوں۔ ہی ہی ہی۔“ وہ قہقهہ مار کر ہنسنے لگے۔
”میں نے کہا۔“ شہزادی۔ اب تو آپ پشنا پاچکے ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ وہ بولے۔

”اور محلے ہی میں رہتے ہیں۔“

”لو اور کہاں رہنا ہے ہم نے۔“

”تو محلے میں جو ہنگامہ ہوا تھا اس کی وجہ سے آپ بڑے پریشان ہوئے ہوں گے۔“ وہ قہقهہ مار کر ہنسنے ”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”بڑا فساد مچا تھا محلے میں۔ آگ لگ گئی تھی۔ لیکن شور زیادہ تھی اور فساد کم، ہمیں بڑی بڑی ڈھنکیاں دیں۔ میدان میں کھڑے ہو ہو کر کہ ہمیں للاکارا۔ لیکن ان باتوں سے کیا ہوتا ہے ہمارے لئے کوئی نئی بات نہیں۔ وہ قہقهہ مار کر ہنسنے۔ ”ہم نے بھی ایسی چال چلی کہ سب کو الو بنایا۔ ہی ہی ہی۔“

”وہ کیسے؟“ شہزادے پوچھا۔

”جب وہ ہمارے پاس آئے محلے کے معزز لوگ۔ کہنے لگے کہ بتائیے اس معاملے میں آپ ایسی کا ساتھ دیں گے یا محلے والوں کا تو میں نے کہا:-

”بھی محلے والے تو شریف کا ساتھ دے رہے ہیں نا؟ ہاں ہاں وہ بولے چونکہ شریف شرافت اور سچائی پر ہے، بالکل درست ہم مانتے ہیں کہ شریف بے حد شریف ہے اور ایسا نے اس سے زیادتی کی ہے بلکہ ظلم کیا ہے، اس پر وہ بولے تو پھر آپ شریف کا ساتھ دیں گے۔ بالکل، میں نے کہا۔ دل و جان سے۔ اس حد تک شریف کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہوں کہ کہو تو ایسی کو عاقِ گرزوں اور اس کی والدہ کو طلاق دے دوں۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔“ کیا ہے؟“ وہ پوچھنے لگے۔

”شرط ہے کہ شریف سب کے رو بروشم کھا کر کہے کہ میں پورے عزم اور استحکام سے اس معاملے کی پیروی کروں گا۔“ میں نے کہا۔“ دیکھوں شریف ایک سادھو قسم کا آدمی ہے اسے دنیا سے کافی نہیں کہی سے دشمن اس کے دل میں نہیں۔ اس کا کیا ہے کل اس جھگڑے کو چھوڑ چھاڑ کر چلا جائے اور اعلان کر دے کہ میں نے سب کو معاف کیا تو پھر ہمارا کیا ہوگا۔ دیکھوں بزرگوں میں نے کہا۔ ہم دنیا دار لوگ ہیں ایسا نہ ہونا کہ ہم شریف کا ساتھ دیں لیکن شریف ہمارا ساتھ نہ دے اور ہم اپنے عزیزوں سے بھی محروم ہو جائیں۔“ علی احمد قہقہہ مار کر فٹے۔

”نتیجہ یہ ہوا۔ علی احمد بولے۔ کہ ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ کچھ لوگوں نے یہی اعتراض کر لیا اور پھر ہوا وہی ایک روز شریف چپکے سے محلہ چھوڑ کر چلا گیا۔ ہی ہی ہی۔ اس روز ہم نے محلے والوں سے کہا دیکھا ہم نے کہا تھا۔ ہمیں اسی بات کا ذر تھا۔ پھر تو وہ سب شریف کے خلاف ہو گئے۔“ علی احمد پھر ہنسنے لگے۔

علی احمد کے آنے کے بعد گویا عزیزوں کا تاثنا بندھ گیا۔ باجرہ کئی مرتبہ ایسی اور شہزادے سے ملنے آئیں۔ فرحت نے بھی دوبارہ ان سے ملاقات کی۔ پھر محلے کے لوگ بلا کلف آنے جانے لگے۔

دوسرا بخش

ایک روز جب ایسا ارم پورہ میں اپنے فرائض سے فارغ ہو کر گھر پہنچا تو اسے

دیکھا کہ لڑکیاں چپ چاپ بیٹھی ہیں اور گھر پر ادا سی چھائی ہوئی ہے۔

”شہزادہ کا ہاں ہے۔“ اس نے پوچھا۔ ”امی کو ہسپتال لے گئے ہیں وہ بیمار ہو گئی تھیں۔“

نفیسہ بولی۔

”کون لے گئے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”پروسیوں نے انہیں ہسپتال پہنچا دیا ہے۔“

ایلی ہسپتال پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ معاملہ نازک ہے اور شہزادہ کی زندگی خطرے میں ہے اس کے پیٹ کا بچہ مر چکا ہے اور مردہ نپے کا زہر اس کے جسم میں سراہیت کر چکا ہے۔

وہ رات خوفناک رات تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔ بارش اور ہوا کا طوفان چل رہا تھا۔ ہسپتال کے چوکیدار کے پاس ایلی کمل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔ نرس کی اطلاع کے مطابق اندر شہزادہ آپریشن ٹیبل پر پڑی تھی۔ اور ڈاکٹر سوچ رہے تھے کہ آیا وہ آپریشن کی تکلیف برداشت کر سکے گی یا نہیں۔

ایلی آگ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں بیرونی طوفان سے زیادہ شدید طوفان چل رہا تھا۔ کیا یہی اس قصے کا انجام تھا۔ سالہا سال کی تگ و دو کے بعد جب کوہ جیون ساتھی بن چکے تھے کیا قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ پھر جدا ہو جائیں۔ اگر شہزادہ کو کچھ ہو گا تو بچوں کا کیا ہو گا؟ وہ سوچ رہا تھا۔

بیتے ہوئے لمحات اس کے سامنے پر وہ فلم کی طرح آرہے تھے۔ جب وہ شہزاد کو پہلی دفعہ بیاہ کر لائے تھے اور ماحقرت ڈبے میں وہ مونگیا گٹھڑی بنی ہوئی تھی۔ حتا مالیدہ ہاتھ گٹھڑی سے نکلے تھے۔ یہ ہے ایلی۔ کسی نے کہا تھا اور وہ ناگ اس کے سر پر منڈلانے لگے تھے۔

پھر جب وہ کہانی سن رہی تھی اور ایلی نے محسوس کیا تھا کہ اس کے انگوٹھے پر ایک

نگلین بوجھ سا پڑ گیا تھا اور اس کا سر بھن سے اڑ گیا تھا جیسے کسی نے ہوائی کو آگ دی ہوا اور ان جانے میں اس نے وہ حنا مالیدہ ہاتھ تھام لئے تھے اور نہ جانے جذبے کی شدت میں کیا کہدیا تھا۔ ”تم ایلی تم۔۔۔“ شہزادے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

پھر بند بیٹھک میں اپنے مردانہ پن کی دھاک جمانے کے لئے وہ سکندر کی طرح حملہ اور تھا اور پھر پوس کی طرح منہ میں کھاس لئے اسکے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔ پھر وہ چلا رہا تھا۔ ”تم روپیں کیمینی عورت ہو۔ آج پھر میرے روپروآتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی کیا؟“ اور وہ اس کے قدموں میں گز کر کہہ رہی تھی ”ہاں ہوں۔“ پھر صدر چلا رہا تھا۔ میں نہیں مروں گا میں نہیں مروں گا۔۔۔۔۔۔ مجھے معاف کرو مجھے معاف کرو۔۔۔۔۔۔“ اور اب شہزادہ آپریشن ٹیبل پر پڑی ایلی سے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے معلوم تھا میں تم سے پہلے مروں گی۔ ہمیشہ سے مجھے اس کا علم تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا۔ مجھے کوئی غم نہیں صرف میری بچیاں۔“ اس نے آخری پچلی ایلی گھبرا کر چونک پڑا۔ چوکیدار جا چکا تھا۔ آسمان پر ہلکی ہلکی سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ طوفان گھم چکا تھا۔ نہ اسے جنجنحوڑ رہی تھی۔ آپریشن کامیاب رہا۔ تمہیں مبارک ہو۔“ ایلی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اسکے دل میں کوئی خوشی پیدا نہ ہوئی اور وہ اسی طرح دیوانہ وار بیٹھا رہا۔ اسے سمجھو میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ کیا کرے۔

پھر ہسپتال کا بھنگلی اس کے روپروکھڑا تھا۔ مردہ بچے کی لاش لے جاؤ۔ وہ کہہ رہا تھا۔

لاش، ایلی سوچنے لگا۔ لاش کو کہاں لے جاؤں۔ کیا کروں۔ لاش!! بھنگلی اسے جنجنھوڑنا رہا تھا۔ ”ابھی لے جاؤ۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اسی وقت اٹھانے والا ہے کوئی۔“ ایلی حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

شہزادہ پتال سے واپس آئی تو ایلی سے دیکھ کر گھرا گیا۔ یہ شہزادیوں تھی۔ جس سے وہ واقف تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی شہزادی تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ گال بری طرح پچک گئے تھے۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ ماتھے کائل گویا گل ہو گیا تھا۔ اس میں وہ روشنی نہ رہی تھی۔ جیسے کسی نے دیپ بجھا کر اس کی گذشتہ روشنی کی یاددازہ رکھنے کیلئے اسے ان طاقوں پر رکھ دیا ہو۔ آنکھوں میں چمک باقی تھی۔ لیکن اس چمک میں ماہی کا دھنڈا کا شامل ہو گیا تھا۔ تا کا ابھر آئی تھی۔ ہونٹ کویا بھیج گئے تھے۔ دانت نکل آئے تھے۔

اسے ڈسچارج کرتے ہونے ڈاکٹر نے کہا تھا اسے ابھی غذا کی ضرورت ہے اچھی غذا اور کیاشم لیکن جب وہ گھر پہنچتی تو ان کے ہاں کچھ آنا اور حموڑی سی دال کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

ان کی غربت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ سر پر قرض کا طومار کھڑا ہو گیا تھا۔ جسے ادا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن اس سے بڑی مشکل یہ تھی کہ فرض حاصل کرنے کے مزید امکانات بالکل ختم ہو چکے تھے۔

لاہور میں ایلی کے ماموں زاد بھائیوں رفیق اور جمیل اور خلیق نے اس کی بے حد امداد کی تھی۔ جمیل ابھی تک خان پور میں تھا۔ رفیق لاہور رہتا تھا چونکہ اس کی تبدیلی ہیڈ آفس میں ہو چکی تھی۔ خلیق اب ڈاکٹر بن چکا تھا اور اکثر لاہور آیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اس کے خالہ زاد بھائی یوسف نے ان کے ساتھ بہت ہمدردی کی تھی۔ لیکن انہیں تو آئے دن امداد کی ضرورت رہتی تھی۔ کبھی کبھار کی بات ہوتی تو بھی وقت گزر جاتا۔ روز کی حاجت مندی کا کیا علاج ہو سکتا تھا۔

دوسری مشکل یہ تھی کہ دولڑ کیاں اب جوان ہو چکی تھیں۔ ان میں شہزادی سی رنگینی تو نہ تھی۔ لیکن پھر بھی وہ شہزادی بیٹیاں تھیں اور اسی گھر میں پل کر جوان ہوئی تھیں۔

لہذا ان کی طبائع میں وہ گھٹا گھٹا پن نہ تھا۔ محلے کی تمام عورتیں ان کے سحرے مندوش تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر یا بھائی یا بیٹے شہزادے کے گھر جائیں یا ان سے ملیں۔ اسیلے یہ سب لوگ چوری چھپے وہاں آتے تھے۔

ان کے آتے ہی فرش بچا دیا جاتا اور پھر سب مل کرتا شیش یا چوپٹ کھینے بیٹھ جاتے اور کھیل میں وہ سب بیٹتے چیختے چلا تے قنیتے لگاتے۔ یہ لگنا تے اور شور مچاتے۔ ایک دھما چوکڑی لگتی رہتی۔ لیکن ان کے جاتے ہی مالی و قتوں کا احساس بیدار ہوتا اور شہزادہ ایک طرف یہ کہوچتی اور آہیں بھرتی۔

لڑکیاں طبعاً ہنسنے پر مجبور تھیں یا ان کا غنقوانی شباب نہیں مسکرا نے پر مجبور کرتا تھا۔ اس لئے وہ نسبتی رہتی تھیں۔ لیکن ان کے دل کی گمراہیوں میں بھی پچھتاوے کی بوندا باغدی شروع ہو چکی تھی۔ غالباً وہ اس احساس کا اظہار صرف ماں کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ مغموم اور افسرده رہنے لگتی تھی۔ شہزادہ کوڈاٹی طور پر کوئی غم نہ تھا نہ وہ پچھلتے کی قائل تھی۔ غالباً اسے بیٹیوں کے غم نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ ایلی نے آنے سے پہلے بار بار شہزادے کہا تھا کہ مالی مشکلات ہو گی۔ اس لئے سوچ لو کیا تم انہیں برداشت کر سکو گی۔ لیکن ان دونوں شہزادوں کے اس سوال کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ ایلی کو اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اب وہ کیوں اکیلی پڑی رہتی ہے کیوں آہیں بھرتی ہے۔ کیوں غم کھاتی ہے۔

شہزادہ کو اپنی بڑی لڑکیوں کی تعلیم کا بھی غم تھا۔ جب وہ گروپن سے آئی تھیں تو دونوں نویں جماعت میں تعلیم پار ہی تھیں۔ ان کے دوسال پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ پہلے سال تو انہیں کسی سکول میں داخل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوسرا سال میں انہیں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ گروپن سے ان کے مٹھفکیٹ دستیاب ہو جائیں۔ لیکن شریف نے ہیڈ مسٹر کو لکھ کر دے دیا تھا کہ جب تک وہ خود ان کے مٹھفکیٹ طلب نہ کرے۔ مٹھفکیٹ جاری نہ کئے جائیں۔ لہذا ان کا دوسرا

سال بھی ضائع ہو گیا تھا اور شہزاد کو ڈر تھا کہ کہیں تیرساں بھی ضائع نہ ہو جائے۔
بوند بوند غم اس کی روح میں سراپا تکر رہا تھا۔

دوپاگل

پھر ایلی کا تباولہ شاہ وال ہو گیا اور وہ سب شاہ وال چلے گئے!

شاہ وال ایک بڑا قصبه تھا جو لاہور سے تمیں چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔
ابھی وہ شاہ وال پہنچے ہی تھے کہ شہزاد پھر بیکار پڑ گئی۔ اسے خون جاری ہو گیا۔ لیڈی
ڈاکٹر نے جواب دے دیا بولی۔ ”اسے لاہور ہسپتال میں لے جائیے۔ لاہور
ہسپتال کے ڈاکٹروں نے معاونت کرنے کے بعد فیصلہ کیا کہ مریضہ کا اندر وہی جسم
مردہ پہنچ کے زہر کی وجہ سے مکلن گیا ہے۔ آپ پیش ہو گا۔
کیا آپ پیش کے بعد مریضہ یقین طور پر ہیک ہو جائے گی۔“ ایلی نے پوچھا۔
”یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔“ ڈاکٹر بولا۔ زیادہ امید نہیں۔“
”اوہ۔“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

جب وہ شہزاد سے ملا تو وہ بولی ”میں آپ پیش نہیں کراؤں گی۔“

”کیوں۔“ اس نے پوچھا۔

”بے کار ہے۔“ وہ بولی۔

”بے کار کیوں۔“

”وہ کہتے ہیں مژا اند پھٹلی جھٹلی تک پہنچ چکی ہے اور خون بند نہیں ہو گا۔“

”تو پھر۔“

”مجھے لڑکیوں کے پاس لے چلو۔“

”اچھا۔“ ایلی نے سر جھکایا۔

جب شہزاد لیڈی ڈاکٹر سے ہسپتال چھوڑنے کی اجازت طلب کرنے گئی تو ڈاکٹر
نے صاف انکار کر دیا۔ ”بے وقوف مت بنو۔“ وہ بلی۔ ”اگر تم ہسپتال چھوڑ کی چلی

گئی تو زیادہ سے زیادہ پندرہ روز جیو گی۔

”اور اگر میں ہسپتال میں رہوں تو۔“

”تو تو تو شاید۔“

شہزادے اپنے کپڑوں کی گھری اٹھائی۔ کٹھبر اگئی۔ ”خوبیں نہیں“ وہ بولی۔

”مجھے کون روک سکتا ہے۔“ شہزادے کہا اور باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر اس کے پیچے پیچھے تھی۔

ڈاکٹر نے ایلی کو دیکھ کر شور مجا دیا۔ ”اے مسٹر۔ یہ تمہاری مسز دیوانی ہو گئی ہے۔“

جان بو جھ کر خود کشی کر رہی ہے۔ اے مسٹر۔“

ایلی رک گیا۔ ”یہ عورت پاگل ہے۔“ ڈاکٹر چلائی۔

”ہم دونوں پاگل ہیں۔“ وہ بولا۔

”اے۔“ ڈاکٹر بولی۔ ”تم پڑھ لکھے نظر آتے ہو۔“

”ہا۔“ ایلی نے کہا ”پڑھا لکھا پاگل ہوں۔“

”اے۔“ وہ گھبرا کر پیچے ہٹ گئی۔ دونوں پاگل باہر نکل آئے۔ شہزادے ایلی کا ہاتھ تھام لیا۔ بولی۔ ”ایلی۔“

”جان مکن۔“ وہ بولا۔

”پندرہ دن ہیں۔“ اس کی آنکھ میں مسرت کی چمک تھی۔

”ہا۔“

”پندرہ دن ہم اکٹھے رہیں گے۔“

”ہا۔“

”پندرہ دن بہت ہوتے ہیں۔“

”ہا ہا وہ بولا۔“

”تم نے کہیں باہر تو نہیں جانا۔“

”خوبیں جاؤں گا۔“

”ہم اکٹھے بیٹھ رہیں گے۔“

”بالکل۔“

”اور پھر ہم بیٹھ کر سب بتائیں وہ رائیں گے۔“

”ہاں۔“

”جب میں نے شہر میں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔“

پندرہ۔ درہ۔ ملن

اپنی ہی وطن میں پاگل بیدل طے جا رہے تھے۔

”بابو جی تانگہ چاہئے، تانگے والے نے قریب آ کر پوچھا۔“

”تانگے پر چلوگی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کیا کرنا ہے۔“ وہ بولی۔

”چلتے ہوئے تمہیں تکلیف ہوگی۔“ وہ بولا۔

”تکلیف۔“ وہ بنسی۔ ”اب کیا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”اب کیا ہے۔“

”امیلی۔“ وہ بولی۔

”جی۔“

”ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“

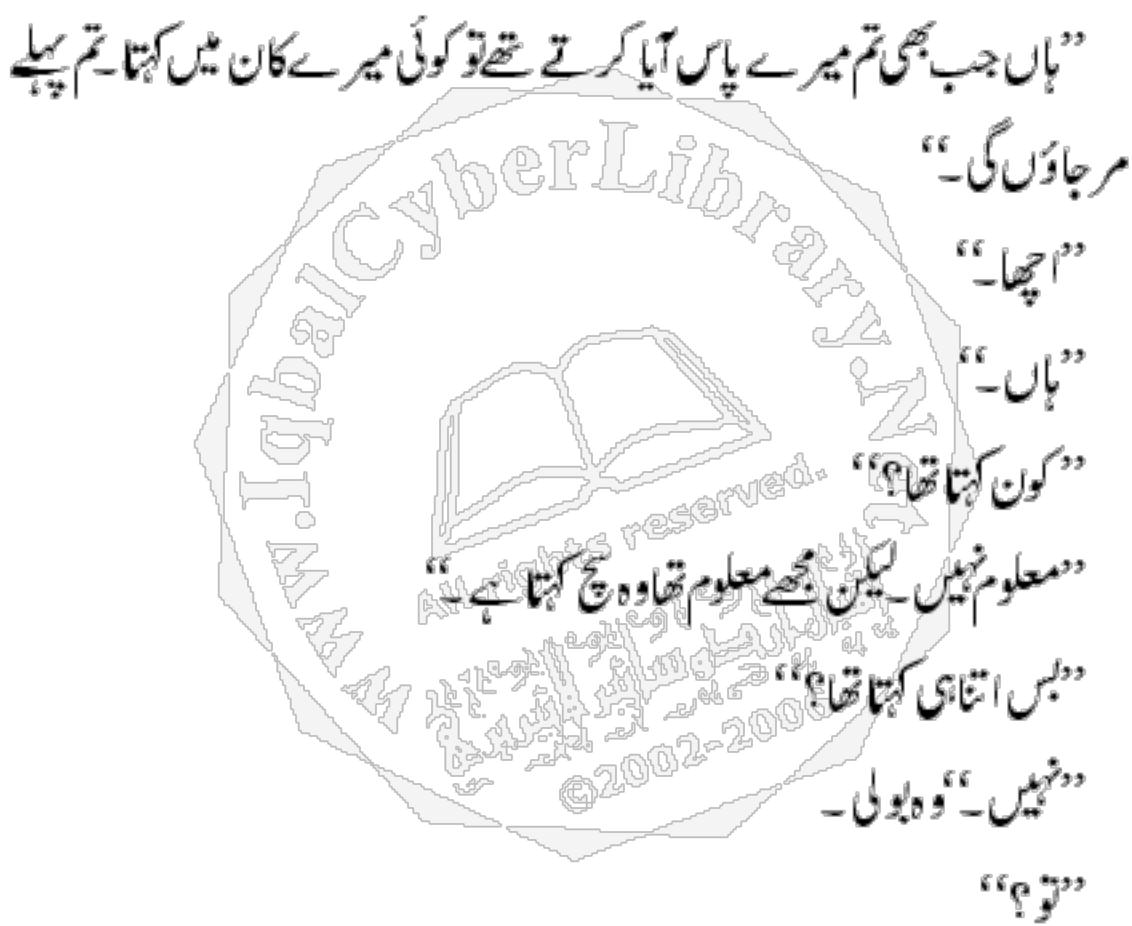
”مانو گے؟“

”مانوں گا۔“

”شروع سے ہی مجھے معلوم تھا۔“

”کیا؟“

”کہ میں پہلے مروں گی۔“
”واقعی؟“



”اے کتابت اور کہتا تھا۔“
”وہ کیا؟“
”کہتا تھا _____ نہیں بتاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرا ہے۔
”نہ بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”لیکن تم روتنی کیوں ہو۔“
”ہاں روتنی ہوں۔“ وہ بولی۔
”اچھا جیسے تمہارا جی چاہے۔“
”اس لئے نہیں روتنی کہ پندرہ دن اور ہیں۔“
”تو کس لئے؟“

”وہ جو دوسری بات کہتا تھا۔ اس پر نہ جانے کیوں اس کی دوسری بات سن کر میں ہمیشہ روتنی رہی چھپ چھپ کر روتنی رہی۔“
”کیا کہتا وہ ایسی بھی کیا بات ہے؟“

”کہتا تھا _____ بتاؤں؟“

”تمہاری مرضی۔“

”کہتا تھا۔ تمہارے مرنے کے بعد اس کی زندگی شروع ہوگی۔“

”کس کی زندگی؟“

”تمہاری۔“

”زندگی ختم ہو جائے گی یا شروع ہو جائے گی۔“

”شروع ہوگی۔“ وہ بولی۔

”اس میں رونے کی آیا بات ہے؟“

”مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے تمہارے راستے کی رکاوٹ ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”اور تمہاری زندگی شروع نہیں ہو سکتی جب تک رکاوٹ دور نہ ہو۔“

”بے وقوف تم رکاوٹ نہیں زندگی ہو۔ تم چلی گئیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”سچ۔“ وہ بولی۔

”تمہاری قسم۔“

وہ مسکراتی۔ ”بس مجھے ایک غم ہے۔ میری بچیاں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے شاہ وال جا رہے تھے۔ انہیں ہونک رہا تھا۔

”پن درہ دن _____ پن درہ دن۔“

وغلتا ایلی کی توجہ سامنے بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف منعطف ہو گئی۔

”پندرہ“ ”دون“ ایک چلا رہا تھا۔ ”صرف پندرہ دون۔“

ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ان کے راز سے واقف تھا۔

”کیوں بھائی؟“ وہ ایلی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”لو تم ہی بتاؤ پندرہ دون بھی کوئی حیثیت رکھتے ہیں؟“ اس نے چلکی بجا لی۔ ”یوں گئے ہے نا۔“ وہ قہقہہ مار کر رہنے لگا

اور پھر اپنے ساتھیوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ”ہم نے تو بس وہی ایک داکٹر دیکھا ہے۔ دو سال میری بیوی میوہ سپتال میں پڑی رہی۔ دو سال آخر انہوں نے جواب دے دیا اور میں اسے دورا ہے لے گیا اور اس اللہ کے بندے نے پندرہ روز میں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں چل کر گھر آئی اور اللہ اس کا بھلا کرے۔ آج ہم بُھی خوش زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

”کون ہے وہ ڈاکٹر؟ ایلی نے پوچھا۔

”دورا ہے کا ہو میوہ پتیتھے ہے جی۔“

”کیا نام ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہاشم

”بھائی واہ۔“ وہ بولا۔ ”تم ڈاکٹر ہاشم کو نہیں جانتے۔“

”جی ڈاکٹر ہاشم کو کون نہیں جانتا۔“ اس کا ساتھی بولا۔

انگلے روزہ ہی ایلی دورا ہے میں ڈاکٹر ہاشم کے معامل میں بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر ہاشم کا معامل ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ جس کے ایک طرف وہ نگ کروں میں ادویات رکھی تھیں اور دو کمپاؤنڈر بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک برآمدہ تھا۔ جس کے پیچے دو وسیع کمرے میں کتابیں پڑی تھیں۔ تیسی طرف ایک دروازے کے پیچے ڈاکٹر کا مکان تھا۔ صحن میں ایک درخت کے نیچے ایک تخت پڑا تھا۔ جس پر ایک پرانا ساتھی لگا تھا۔ نیچے ایک سادہ گدا بچھا ہوا تھا ایک چھوٹے سے ڈیک کے گرد بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ پاند ان محمدب شیشه۔ ریڑ کی نلکیاں۔ ڈسک پر ایک پرانا قلمدان پڑا تھا۔ یہ ڈیک تخت پر لگا ہوا تھا۔ اور اس کے پاس ہی کافند کی پر چیاں ہی پڑی تھیں۔ تخت کے ایک طرف بو سیدہ کالا کمبل ڈھیر ہو رہا تھا۔ صحن میں کوئی کرسی نہ تھی۔ کتابوں والے کمرے میں بیٹھنے کے لئے فرش کے علاوہ کوئی کرسی یا کاؤچ نہ تھا۔ صحن میں لوگ ادھرا دھر زمین پر چوکیاں رکھے بیٹھے ہوئے

تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے باقی کرنے میں مصروف تھے۔ اور یوں شور مچا رہے تھے۔ جیسے وہ داکٹر کا معامل نہیں بلکہ سڑمنڈی ہو۔ ڈاکٹر ابھی زنان خانے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

وقتاً زنان خانے کا دروازہ کھلا۔ ایک لڑکا ایک حقہ اٹھائے باہر لکلا۔ اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک دیوانہ سا آدمی یوں اڑھکتا ہوا آرہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے دھنادے کمپڑ کر دیا ہو۔ اس نے ایک لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا۔ نیچے سیاہ جریبیں تھیں۔ یک پھٹی ہوئی اُر گابی۔

اس کے بال پر یہاں تھے۔ چہرہ گویا سو جا ہوا تھا۔ آنکھیں چند ہیلائی ہوئی تھیں۔ تخت کے قریب پہنچ کر وہ رکا۔ اس نے بڑھ کر سب جان اٹھایا اور اسے اپنے گرد لپیٹ کر تخت پر ڈھیر ہو گیا۔

مجموع پر خاموشی طاری تھی۔

ایک ساعت کے بعد اس نے سراٹھایا اور مجموع پر اچھتی نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہ ایک آدمی پر رکی۔ ”ہوں۔“ وہ بولا۔ ”تم۔“ ”جی۔“ وہ شخص وہ بولا۔

”تمہاری بیوی مر گئی ہے کیا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔
”جی نہیں۔“ وہ شخص بولا۔

”تو اس کا براحال ہے کیا؟“

”جی نہیں۔ الثا وہ رو بصحبت ہے۔“

”تو پھر تم کیوں آئے ہو۔“ ڈاکٹر نے اسے ڈانگا۔

”جی دوا لینے۔“

”کیسی دوا۔“

”جی دوائی۔ یعنی۔“ وہ گھبرا گیا۔

”جب وہ رو بصحت ہے تو دوائی کا مطلب۔ دوائیاں لینے کا شوق ہے کیا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں نے سمجھا کہ مزید دوائی _____۔“

”بے قوف۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”میں نے سمجھا کہ تم میں مجھنے کے صلاحیت ہے۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

”جی بہت اچھا۔“

”جاوہر مزے کرو۔ اب کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔“ وہ شخص سر جھکائے چل پڑا۔

”ہوں تم۔“ ڈاکٹر کی نکاح ایک اور شخص پر پہنچی تھام۔ ”تم۔“ وہ بولا۔

”جی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میرا نام ماجد ہے۔“

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا نام کو میں کیا کروں۔ تمہیں تپ دق ہےنا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”تو جاؤ تمہارے لئے میرے پاس کوئی دو انہیں جاؤ۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب۔“ وہ بولا۔ ”میں کہاں جاؤں گا؟“

”تم اللہ کے پاس جاؤ گے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”وہاں سکھی رہو گے۔ جاؤ

جاوہر جاؤ۔“

وہ شخص مایوس ہو کر چل پڑا۔

”ہوں۔“ ڈاکٹر نے ایلی کی طرف دیکھا۔

”جی میں۔“ ایلی وہ بولا۔ ”میں شاہ وال سے آیا ہوں۔“

”تو کیا مجھ پر احسان کیا ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔ میاں لوگ حیدر آباد سے آتے ہیں۔ ”وہ رک گیا۔“

”میسور سے آتے ہیں۔ تم شاہ وال سے آگئے تو کیا ہوا۔“ اس نے دوبارہ کہا۔

ایلی گھبرا گیا۔ ”جی آپ بجا فرماتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کیا فائدہ ہوا شاہ وال سے آنے کا کیا فائدہ ہوا۔ بے قوف۔“ ڈاکٹر گھوڑتا رہا۔
ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔

”لو بھائی اس شخص کی طرف دیکھا۔“ ڈاکٹر نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔
”یہ شاہ وال سے آیا ہے لیکن بے قوف مریض کو ساتھ نہیں لایا۔“

”ارے،“ ایلی حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔
”میاں۔“ ڈاکٹر کہنے لگا۔ ”اگر تم مریض کو ساتھ لائے تو کیا میرا منہ دیکھنے آئے
ہو۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔
ڈاکٹر قہقہہ مار کر نفس بیولائی اچھا تو دیکھو۔
میں اس وقت ایک معزز زہن دو داخل ہوا اور ورواز سے میں اسی ہاتھ جوڑ کر بولا۔
”نمیتے ڈاکٹر صاحب۔“ ڈاکٹر صاحب کی توجہ نووارد کی طرف منعطف ہو گئی۔

”یہ لالہ جی دورا ہے کہ تحصیلدار ہیں۔“ قریب سے اسی آوازیں آئیں۔

لالہ جی قریب آ گئے۔ وہ ایک معزز اور شریف آدمی نظر آتے تھے اور انداز بلا کا تھا۔ جب وہ قریب آئے تو ڈاکٹر نے بغوران کی طرف دیکھا۔
”لالہ جی۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔“
تحصیلدار نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”تشریف لے جائیں۔“ ڈاکٹر نے دہرایا۔ ”پھر سے داخل ہوں اور السلام علیکم
کہیں۔“

تحصیلدار کھڑی ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔
”جب تک آپ ایسا نہیں کریں گے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ میں آپ کو دو انہیں دوں
گا۔

”لیکن ڈاکٹر صاحب۔“ تحصیلدار نے کہا۔ ”میں نے داخل ہوتے وقت ہاتھ

باندھ کر آپ کو نہستے کی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”نہستے کرنے میں کیا برائی ہے؟“ تھیصلدار نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“

”الناس میں تو بے حد عجز ہے۔“

”جی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”آپ بالکل بجا فرمادے ہے ہیں۔ ان میں بہت عجز ہے۔ لیکن از راہ کرم واپس جائیے پھر داش ہو کر السلام علیکم کہیے۔ بتا کہ میں آپ کو دوائی دوں۔“

اس پر تھیصلدار صاحبِ مسکرا نے اور احاطے سے باہر نکل گئے۔ پھر داخل ہوتے ہوئے بولے۔

”السلام علیکم۔“

”علیکم السلام۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”فرمائیے کس کے لئے دوائی لیما ہے آپ نے۔“ ”گھروالی کے لئے۔“ وہ بولے۔

”اپنی گھروالی کو اپنی طرح تحمل پسند بنائیتے نا۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”وہ اپنی طبیعت کی تلخی کی وجہ سے بیمار رہتی ہے۔“

”یہ میری بس کاروگ نہیں۔“ تھیصلدار نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ان کی بیماری کی تفصیلات سن لیجئے۔“

”نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”پہلے ہمیں ایسی دوائی دنیا ہو گی۔ جس سے ان کی طبیعت بدل جائے۔“

”دوائی سے طبیعت بدل جائے۔“ تھیصلدار نے کہا۔

ڈاکٹر نے قلم نیچے رکھ دیا آپ دوائی کو کیا سمجھتے ہیں لا الہ جی۔“ آس نے پوچھا۔ شاید آپ سمجھتے ہیں کہ دوائی صرف پیٹ کا درود دوکرتی ہے۔ کھانی کو روکتی ہے۔

اسہال کو بند کرتی ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحب۔“ وہ بولے۔

”آپ غلط سمجھتے ہیں اور یہ ایک خوراک دینے کے بعد۔“ ڈاکٹر نے پرچمی پر لکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ وہ ایسی کیا چیز ہے۔“

”مجھے اجازت ہے کہ ایک بات پوچھوں۔“ ایلی بولا۔ ڈاکٹر نے مرکرایلی کی طرف دیکھا۔

”لالہ جی بھی تو مریض کو ساتھ نہیں لائے۔“ وہ بولا۔

”تو پھر،“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”تو پھر۔ انہیں کیون وہی دے رہے ہیں آپ؟“

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ”اس کا جواب تمہیں اس وقت دیں گے جب تم مریض کو ساتھ لاؤ گے اب مہربانی کر کے چلے جاؤ۔“ ڈاکٹر نے اسے دانما اور چپ چاپ ٹھن سے باہر نکل آیا۔

کمل کی گٹھڑی

شاہ وال کو واپس جاتے ہوئے ایلی سوچ رہا تھا۔ ایسا ڈاکٹر تو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ ہی ہومیوپیٹھی سے اسے کبھی سابقہ پڑا تھا۔ علاج بالمثل کے تصور سے ہی وہ بیگانہ تھا۔ عجیب ڈاکٹر تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے معلوم تھا کہ وہ مریض کو اپنے ہمراہ نہیں لایا۔ شکل و صورت کی بھی بات نہ تھی۔ چونکہ دیکھنے میں تو وہ ہمیشہ ہی مریض دکھائی دیتا تھا۔ بہر حال عجیب ڈاکٹر تھا۔ ایلی کے دل میں بے وجہ یقین پیدا ہوا جا رہا تھا۔ کہ شہزاد صحت مند ہو جائے گی۔

جب اس نے شہزاد سے بات کی تو وہ نہ پس پڑی۔

”اب یہ چودہ دن بھی ضائع کرو گے۔“ وہ بولی۔ ”ایک دن ضائع کرائے ہو۔“ اکٹھے جائیں گے۔ ایک ہی ڈبے میں ٹھیسیں گے۔ ایلی نے کہا۔ ”پھر کیسے دن

ضائع ہوگا۔ تم سمجھ لینا کہ سیر کرنے جا رہے ہیں۔“

”اور داکٹر کو دینے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔“

”اللہ مالک ہے۔ وہ بولا۔“ کچھ ہوئی جائے گا۔“

شہزاد تیار ہو گئی۔ ایلی نے سوچا کہ رات کو سفر ٹھیک نہیں۔ سارا دن سفر کریں تاکہ شہزاد کو تکلیف نہ ہو۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر ہاشم شام کے وقت بھی معمل میں آتے ہیں یا نہیں۔ لیکن سوایہ تھا کہ وہ رات کہاں گزاریں گے۔ چلو ٹیشن پر مسافر خانے میں بیٹھدے ہیں گے اس نے سوچا اور وہ اسکی روز دورا ہے کو روانہ ہو گئے۔

شام کو عین بجے کے قریب وہ دوڑا ہے پہنچ۔ ایلی شہزاد کو کے سریدھا معمل میں پہنچا۔ معمل کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی مریض نہ کمپا۔ اندھرا سے شہزاد کو باہر صحن میں بٹھا دیا اور خود اور ہر جھانکتے گا۔

کتابوں والے کرے میں کمبل کی گھڑی سی پڑی ہوئی تھی۔ ایلی مایوس ہو کر صحن میں آگیا۔ اور چپ چاپ تخت پر بیٹھ گیا۔ دریک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔
کمبل کی گھڑی کو حرکت ہوئی۔

”اے۔“ ایلی چونکا اور پھر اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر کمبل اوڑھے گھڑی بنان پڑا تھا۔

ایلی ڈر رہا تھا کہ کہیں بگڑ نہ جائے۔

”کون ہے؟“ داکٹر بولا۔

”جی میں ہوں۔“ ایلی بولا۔

”میں کون؟“

”میں شاہ وال سے مریضہ کو لایا ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ بولے۔ ”تم شاہ وال والے ہو کیا؟“

”جی۔“

ڈاکٹر نے کمبل سے ہاتھ نکالا۔ اس کا سر اور منہ کمبل ہی میں لپٹے رہے۔ ”نبض دکھا وے،“ وہ تحکماں لجئے میں بولے۔ ”ادھر آؤ مریضہ۔“

ایلی نے شہزاد کو گھیٹ کر پاس بٹھا دیا تو ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹھوٹی۔

”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا اور نبض تھامے بیٹھا رہا۔

”دوسرا ہاتھ۔“ وہ بولा۔

شہزاد نے دوسرا ہاتھ تھما دیا۔

دیر تک ڈاکٹر نبض تھامے جوں کا توں بیٹھا رہا۔

”جسم سے خون جارگی ہے نا۔“ وہ بولा۔

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”اندر گلی گیا ہے۔“

”جی۔“ ہسپتال والوں نے یہی کہا تھا۔

”ٹھیک کہا تھا۔“ وہ بولा۔

”انہوں نے کہا تھا پندرہ روز اور جئے گی۔ دایا فرام کو گھن لگ گیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ڈایا فرام کو گھن لگ چکا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”لیکن یہ کہنے والے وہ کون ہیں کہے پندرہ روز جئے گی۔ وہ کیا خدا ہیں؟“ ڈاکٹر غصے میں کہا۔
ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

”بولو۔“ وہ ڈائٹ نئے لگا۔ ”بولو۔“ وہ کون ہیں۔ صحبت اور رومت اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر وہ کون ہیں؟“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”تم مسلمان ہو؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

اچھے مسلمان ہوتم۔ ”ڈاکٹر نے ایلی کوڑا نما اور دفعتاً اپنا منہ کمبل سے باہر نکال کر اس کی طرف دیکھا۔ ایلی ڈرگیا۔ ڈاکٹر انکھیں انگارہ سی چمک رہی تھیں۔

”مسلمان ہوتے ہوئے تم نے ان کے منہ پر تھپٹر نہ مارا۔ کیسے مسلمان ہوتم۔“

ایلی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ ڈاکٹر نے کمبل پرے پھینک دیا اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

ایلی کو کچھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے آیا وہیں بیٹھا رہے یا باہر چلا جائے۔ نہ جانتے ڈاکٹر کیوں باہر گیا تھا۔

وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے ہے۔

”لو۔“ ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔

”ارے۔“ ایلی چونکا۔

”منہ کھولو۔“ وہ بولا۔

ایلی نے منہ کھول دیا۔

”بے وقوف۔“ ڈاکٹر چلایا۔ ”مریض وہ ہے یا تم۔“

ڈاکٹر راتھ میں ایک پڑیا اٹھائے کھڑا تھا۔

شہزاد نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے پڑیا اس کے منہ میں انڈیل دی۔ ”جاو۔“ وہ بولا اور پھر راتھ جھکلتے ہوئے کہا۔

”جاو۔“ چلتے جاو اور اچھے ہوتے جاو۔“

ایلی جیرانی سے اس کا منہ تک رہا تھا۔

”آپ کی فیس۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے دس کا نوٹ لکالا۔

”فیس _____ وہ بولا۔“ ”تم میری فیس دے سکتے ہو کیا؟“

”جی نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”دواں کی قیمت۔“

”دو آنے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”دو آنے۔“

ایلی نے گھبرا کر دو آنے لگا۔

”رکھو۔“ وہ بولا۔ ”رکھو۔“

ایلی نے دونی رکھ دی۔

”گھر کے لئے دوا۔“ ایلی نے کہا۔

”غیریں۔“ وہ بولا۔ ”جاو۔“ یہی کافی ہے۔“

”کوئی پرہیز۔“ ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر نہسا۔ بیوقوف کھانے کو نہیں نہیں آتا اور پوچھتے ہیں پرہیز۔ جاو۔“ وہ چلا یا۔ ”مہرو۔“ ڈاکٹر نہیں جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ”پندرہ روز کے لئے تم اس کے خاون نہیں ہو اور یہ تھماری بیوی نہیں سمجھے۔“ ”جی۔“ ایلی بولا۔

”سوہو ہویں دن کوئی بندش نہیں۔“

ایلی اور شہزادبہر نکل توہ حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”یہ ڈاکٹر ہے کیا۔“ شہزاد نے پوچھا۔

”ہاں ڈاکٹر پاشم۔“

”مجھے تو پاگل دکھتا ہے۔“ وہ بولی۔

”مجھے بھی۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن سمجھ لو اللہ نے فرشتہ بھیج دیا ہے۔“

”مجھے تو ڈھونگی معلوم ہوتا ہے۔“ شہزاد نے کہا۔

”غیریں خالی پاگل۔ پگلا پن اور قابیلت ایک ساتھ ملتے ہیں۔“

”قابل آدمیوں کی شکل ایسی ہوتی ہے کیا۔“ شہزاد نے بر اسمہ بنایا۔ شاہ وال پہنچ کر پندرہ دن شہزاد اور ایلی نے گن گن کر کاٹے۔

ہنی موں

سوہو ہیں دن ایلی نے پوچھا۔ ”شہزاد کیا خون ابھی جاری ہے؟“

وہ مسکرائی۔ ”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”کب سے ختم ہو گیا۔“
”تم نے مجھے بتایا نہیں۔“

”میں نے کہا۔ شاید پھر جاری ہو جائے۔“

”تو نہیں ہوانا۔“

”اوہوں۔“ وہ بولی۔

”تو وہ دو ای کام کر گئی تا۔“

”پتہ نہیں۔“ وہ باتی۔

”ایک بات کہوں۔“ میں نے اسے تحفے ہونے کے کہا۔

”کہو۔“

”مانوگی؟“

”کہو تو۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پہلے کہو مانوگی۔“

”مانوں گی۔“ وہ پیار سے بولی۔

”آج ہمارانہی مون ہے۔“ وہ بولا۔

شہزادے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

”آج ہم پرانے زمانے کی یاد مانا گیں گے۔“

”کیسی یاد۔“

”جب تم مو نگیہ گھڑی تھیں۔ تب کی یاد۔“
وہ مسکرائی۔

”اب کہاں۔“ وہ بولی۔ ”اب وہ بات کہاں؟“

”اب بھی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیسے؟“

”میرے لیے ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

شہزادے پیارے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یاد ہے وہ زمانہ۔“ وہ بولا۔

”ہوں۔“ شہزادے نہیں۔ ”بھول سکتا ہے کیا؟“

ایلی نے زیریں کہا۔ ”آج میں آؤں گا۔“

شہزادے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔

ایلی نے پھر سرگوشی کی۔ ”کھڑکی کھلی رکھنا۔“

شہزادہ با معنی انداز سے مسکرا لی اور اشیات میں سر ہلا دیا۔

ایلی باہر نکل گیا شام کو وہ اوہڑا دھرم لٹارتیا۔ حتیٰ کہ زونچ لگتے۔ پھر وہ سینما میں جا بیٹھا۔ جب وہ فلم دیکھ کر نکلا تو سائز ہے گیا رہ بجے تھے۔ وہ چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔ شاہ وال کی گلیاں ویران پڑی تھیں۔ کتنے بھونک رہے تھے۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے دبے پاؤں چل رہا تھا۔ گھر کے پاس جا کر وہ رک گیا اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر جست بھر کرو وہ کھڑکی کے پاس جا پہنچا۔ پٹ کو آہستہ سے دبایا۔ پٹ کھل گیا۔ دبے پاؤں وہ اندر داخل ہو گیا۔

چار پائی پڑھزادے چادر اور اڑھے مشین سامنے رکھ کر رہی تھی۔

ایلی نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ ”چپ۔“ وہ بولا۔

شہزادہ مسکرا لی۔

”چائے پلاوے گی۔“

اس نے اشیات میں سر ہلا دیا۔

ساری رات وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھے چائے پیتے رہے۔ جب بھی کوئی کھلکھلتا ہوتا تو وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔

”کون ہے۔“ وہ زیریں کہتا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ گنگاتی اور پھر باہر نکل جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر اس کے پاس آئی۔

یونہی صحیح ہو گئی اور ایسا اسے الوداع کہہ کر کھڑکی سے باہر نکل گیا اور پھر صدر دروازے سے گھر میں داخل ہو کر اپنے بستروں پر پڑ کر سو گیا۔

سراب

شاہ وال ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔ وہاں کام و رسم بھی کافی بڑا تھا اگرچہ عمارت پرانی تھی۔ لیکن شہر کے ساتھ وہ سعی و سریض میدان تھے۔ سکول کے قریب ہی بوڑنگ کی عمارت تھی۔ جس میں شاہ وال کے گرد و نواح کے دیہات کے لوگوں کے رہتے تھے۔ بوڑنگ کے سپر نئندنٹ کا کوانٹو ورڈنگ کی عمارت کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔

سکول کے ہیڈ ماسٹر کا نام سراب تھا۔ اس کا قدیم چھوٹا تھا۔ جسم گول مٹول رنگ گورا اور چہرہ فٹ بال کی طرح تھا۔ جس میں اس قدر ہوا بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ سراب کی آنکھیں دکھائی ہی نہ دیتی تھیں۔ کبھی طوع ہوتیں بھی تو جیسے دو لکیریں ہوں اور پھر وہ جلد ہی غروب ہو جاتیں چونکہ سراب کو بات بات پر ہنسنے کی حادث تھی۔ جب وہ ہنستا تو گوشت کا ایک طوفان چہرے پر چلتا۔ بڑھتا سملتا۔ آنکھیں کشیوں کی طرح لہروں میں دوب جاتیں۔ لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ ہوتا یا جان بوجھ کر غصے میں آ جاتا تو دو بھوری دھاریاں ابھر تیں حتیٰ کہ وہ کثاریں بن جاتیں۔ ان میں دھار پیدا ہو جاتی اور وہ بری طرح سے کائیں لگاتیں۔ ایسا سراب کو مل کر بے حد خوش تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کے درمیان گز ارا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا۔ کہ اساتذہ زیادہ تر سمجھی یا کتابی زندگی بر کرتے تھے۔ و سمعت نظر سے قطعی طور پر بیگانہ تھے۔ چونکہ ان کا مطالعہ محدود تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ زیادہ تر زندگی بچوں میں بر کرتے تھے۔ ان کی شخصیت رسمی خیالات جذبات اور حرکات کا مجموعہ تھی۔ وہ سب ایک ہی دائرے میں گھونتے تھے اور اپنے خیالات علم اور

نظریات کو ناجائز طور پر بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ہاتھی دانت کی طرح انہوں نے اخلاقی معیار پاں رکھتے تھے۔

ایلی اساتذہ سے اکتا چکا تھا۔ ان میں نہ تو وہنی چمک تھی نہ سمعت تلک اور نہ ہی وہ رنگینی جذبات سے واقف تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر تو بالکل ہی ایلی کے لئے ناقابل قبول تھے۔ وہ اساتذہ کے بھی یوں پیش آتے۔ جیسے وہ بچے ہوں۔ مدرسے میں وہ ایک جزیرے کی طرح الگ تھلک رہتے اور یا اساتذہ کے قریب آتے تو یہ موقع رکھتے کہ وہ ان کی ہر بات کو سراہیں۔ ان کے ہر خیال پر واہ واہ گریں۔

سراب میں خودستائی کی واضح جھلک تو تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں رنگینی کا غصر مفتوحہ ہوتا۔ جسے وہ بڑی محنت سے چھپا کر پھرتے تھے۔ اس وجہ سے بڑوں کی نسبت وہ بچوں سے قریب تر تھے۔ ان کے گھر میں نوجوان طلباء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ انہیں پڑھاتے تھے۔ چھیرتے تھے گھورتے تھے اور پیار کرتے تھے۔

نہ جانے کیون ایلی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ ہیڈ ماسٹرنیمیں۔ جیسے کسی میم نے زبردستی سوٹ پہن رکھا ہو یا کوئی دہن شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر مردانہ لباس میں باہر نکل آئی ہو۔

ان کی بیگم ایک معزز خانہ ان کی خاتون تھیں۔ نہ جانے کیوں یہ وہم اس کے گلے کا ہار ہو رہا تھا کہ ان کا مکان پاک صاف نہیں۔ لہذا وہ بہت سے طالب علموں کو اکٹھا کر کے گھر کی صفائی میں لگی رہتی تھی۔ فرش دھلواتی۔ دیواریں جھاڑتی۔ دروازوں کے تنتوں کو پانی سے دھوتی حتیٰ کہ دروازے کی زنجیروں کو پاک کرنے کے لئے ان پر صابون ملتی۔

گھر کے اندر زنانے میں وہ ہر وقت صفائی میں مصروف رہتی تھی۔

باہر مردانے میں سراب نوجوان طلباء کے جھرمٹ میں راجہ اندر بننے بیٹھے رہتے۔ لیکن اس اندر میں راجہ کی نسبت رانی کی زیادہ جھلک تھی۔

سراب کو دیکھتے ہی لاشوری طور پر ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق روانہ رکھے گا۔

مثلاً سراب اس سے پوچھتے۔ ”اصفی صاحب آج آپ لیٹ کیوں آئے ہیں۔“
”کیا آپ اخلاقی فرض نہیں کر آپ وقت پر سکول آئیں۔“ وہ بصد مشکل اپنے آپ پر بخیج دی گی طاری کر کے کہتے۔

”اخلاقی فرض تو نہیں سراب صاحب۔“
”کیوں۔“

”تو کہوں لہذا وقت پر آنا چاہئے۔“

”یہ فرض ہوا۔“

”جی اخلاقی فرض تو نہیں نہ۔ دیکھئے سراب صاحب آپ میرے افسر ہیں اور میں آپ کا ماتحت ہوں۔“ ایلی کہتا۔ ”میرا فرض یہ ہے کہ آپ کو خوش رکھوں۔ اور بس۔“
سراب صاحب کے گال مرخ ہو جاتے۔ چہرے پر گوشت کی لمبہیں چلنے لگتیں اور آنکھیں غروب ہو جاتیں۔

”بہر صورت آپ وقت پر آیا کریں۔“ وہ کہتے۔

”بہت اچھا صاحب۔“

اگلے روز ایلی پھر لیٹ آتا۔

سراب نے سوچا کہ ایلی کو شرمندہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انہوں نے خود وقت پر آنا شروع کر دیا۔ آتے ہی وہ ایلی کو تلاش کرتے اور پھر اس کی جماعت میں جا کر خود پڑھانا شروع کر دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایلی دو ایک روز صورت حالات کا جائزہ لے گا تو شرمندگی محسوس کرے گا۔ لیکن ایلی نے یہ دیکھ کر کہ سراب صاحب اس کی جماعت کو پڑھا رہے ہیں۔ پہلے پریڈ میں آنا ہی بند کر دیا۔ اس پر سراب صاحب بہت سث پٹائے اور اس امذہ کی مینگ میں انہوں نے اس بات کا تذکرہ

کیا بولے۔ ”شمندہ ہونے کی بجائے اصفی صاحب نے پہلے پریڈ میں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

ایلی نے کہا۔ ”جناب عالی دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ آپ مجھ سے بہتر پڑھاتے ہیں۔ لہذا میرا جی نہیں چاہتا کہ اپنی جماعت کو آپ کے درس سے محروم کروں۔“

سراب صاحب کو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ الیاس کا برتاب و بانی اساتذہ سے ہٹ کر ہے۔ اور وہ دل ہی دل میں اس پر خوش تھے۔

ایک روز یلی سے سراب نے اپوچھا۔ ”اصفی صاحب آپ کا رویہ باقی اساتذہ کا سانہیں کیا وجہ ہے؟“

” وجہ یہ ہے۔“ وہ بولا کہ آپ کا رویہ باقی ہیڈ مائیٹروں کا سانہیں۔“

وہ مسکرائے ”کیا فرق ہے؟“ وہ بولے۔

”وہ فرق جو سوکھے اور ہرے بھرے درخت میں ہوتا ہے۔“

چند ایک روز تو ایلی باتوں کی مدد سے اپنے قدم جاتا رہا۔ پھر جب اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تو ایک روز جب وہ اکیلے تھے۔ ایلی نے نہ جانے کس بات کے جواب میں اپنے دل کی بات از راہ مذاق کہہ دی۔ کہنے لگا۔ ”سراب صاحب کسی وقت تو میں ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے آپ وہن ہوں۔“ دفعہ اسرا ب صاحب میں چھپی ہوئی عورت تمام احتیاط اور ضبط کو توڑ پھوڑ کر بڑا ہی نکل آئی۔ اس نے نوش کر اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور بہ نہ ایلی کے روبرو آکھڑی ہوئی۔

سراب کے چہرے پر سرخی جھلکی۔ وہ سرخی نہیں جو دورانِ خون تیز ہونے پر جھلکتی ہے بلکہ وہ سرخی جو دہن کا گھونگھٹ اٹھنے پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایلی جیران رہ گیا۔ اسے رہنگلی کا خیال نہ تھا۔ تو قع نہ تھی۔ وہ گھبرا کر چلا آیا۔ اس کے بعد سرا ب اور ایلی کے درمیان ایک حباب سا دیوار بن کر حائل ہو گیا۔ جیسے وہ دونوں کسی راز سے

کپور اور ریاض

درستے میں سراب کے علاوہ دو شخص پیش پیش تھے۔ ایک تو سکول کے دفتر کا کفر کر تھا۔ اس کا نام ریاض تھا۔ اس کا جسم فربہ کی طرف مائل تھا۔ رنگ کالا تھا اور طبیعت میں حکر ان کی بو کے علاوہ اخلاق، نیکی اور سچائی کی طلب کا جنون تھا۔ دوسرا شخص کپور تھا۔ کپور سینیر اکٹش ٹیچر تھا۔ اس کا قد و رمیانہ تھا۔ طبیعت میں بلا کا عجز اور مٹھاں تھی۔ کپور اپنے لئے بغایب بلکہ دوسروں کے لئے بیٹھتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے جیتا تھا۔ وہ یہ شخص کسی دل کی شخص کی جائزیاتاً عجائز انداد پر کمر بستہ رہتا تھا۔ صحیح سوریے گھر سے نکلتا اور پھر رات کے گھر لوٹتا اور سارا دن کسی نہ کسی حاجت مند کے کام میں مصروف رہتا۔ کوئی اسے پچھرنا لے جاتا تاکہ مقدمے میں اس کی امداد کرے۔ کوئی اسے اپنی بیٹی کی شادی کے جملہ انتظامات سونپ دیتا۔ کوئی کہتا بھائی کپور۔ تھوڑا سا قرض چاہئے۔ کہیں سے انتظام کر دو۔ کوئی اسے ٹیکش کے لئے فرمائش کرتا اور اگر کوئی کام نہ ہوتا تو کپور گھر گھر لوگوں سے ملتا۔ ”کوئی سیوا بتائیے صاحب۔“ وہ کہتا۔ ”آپ کا سیوک ہوں۔“ ایلی کے لئے ریاض اور کپور دونوں نعمت غیر مترقبہ تھے۔ وہ دونوں ایلی کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ کپور اسے ادھار سودا لا دیتا تھا۔ ریاض اڑکیوں کو ٹھنڈائی کے بغیر گرلز سکول میں داخل کرنے کے لئے ٹگ و دوکر رہا تھا۔ پھر کپور نے ان کی فیس معاف کرانے کا ذمہ لے لیا اور ریاض ان کے لئے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی طرح دوں ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد سے کرتے رہے۔ سراب کو بھی ایلی کے حالات سے بے حد ہمدردی تھی۔ لیکن سراب کی ہمدردی کو عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایلی کی جملہ مشکلات مالی نوعیت کی تھیں تجوہ میں اس کا گزر انہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اس پر قرض کا طومار لگا جا رہا تھا۔ اس کے قرض خواہ ادا بیگنی کے لئے تقاضہ

کرتے اور ایلی دوڑ کر کہو رکھنے کی طرف بھیجا تا کہ اسے کچھ دیر اور انتظار کرنے پر راضی کرے۔ اگلے روز کپڑے والا آ جاتا اور ایلی ریاضی کی طرف دوڑتا۔

کپور اللہ واسطے کام کرنے کا قائل تھا۔ مگر ریاض طبیعت کا خت تھا وہ کام تو کرتا تھا مگر ساتھ لکھر بھی پلاتا اور اس بات کا مطالبہ کرتا کہ ایلی اس کی عظمت اور نیکی کا اقرار کرے۔ اس کے علاوہ وہ ایلی پر خوش نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آخر یوں کب تک گزارا ہوگا۔ اس کا کوئی عملی تدریک کرنا چاہئے۔ ریاض اور کپور چاہتے تھے کہ ایلی کوئی ٹیوشن کرے اور اس طرح اپنی آمد نی میں اضافہ کرے۔ لیکن ایلی ٹیوشن کا قائل نہ تھا۔ اس کی زندگی نظم سے خالی تھی۔ وہ بلا ناظم مقربہ وقت پر حاضر ہو کر کام کرنے کی امیت نہ رکھتا تھا۔ شاید اس کی وجہ تھی کہ ایلی محنت سے گرین کرتا تھا اور ریاض کو یہ بات پسند نہ تھی۔

کپور اور ریاض کے علاوہ شاہ وال سکول میں ایک اور شخص بھی تھا جو جونیئر لیچر تھا۔ اس کا نام شاء اللہ تھا۔ شاء اللہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی۔ جو ایلی کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔ اس کا جسم موٹا تھا۔ منہ سو جا سو جا طبیعت میں شوہی یا رنگیں کاغذ نام کو نہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک معزز زادی تھا۔ البتہ افسروں کے خلاف شکایت کرنے کی عادت تھی۔ کسی کو اکیلا دیکھ پاتا تو اسے پکڑ کر زیر لب افسروں کی شکایت کا دفتر کھول لیتا زندگی میں یہ اس کی واحد دلچسپی تھی۔ شاء اللہ کی ایلی سے راہ رسم صرف اس لئے ہو گئی کہ ان دونوں کے مکانات ایک ہی محلے میں واقع تھے۔ ایلی سکول سے واپس آتا تو شاء اللہ آنکھتا۔

”یہ سراب بڑا حرام ہے“ وہ اوہر اہر دیکھ کر زیر لب کہتا۔ ”اس کے کارنے مے سنو گے۔ بھائی صاحب تو دنگ رہ جاؤ گے۔ بس اندر کا اکھاڑہ بنار کھا ہے۔ اس سے مدر سے کے بچوں کے اخلاق تباہ ہے ہیں۔

”تعلیم تو محض بہانہ ہے۔“

”ایلی صاحب کپور کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ اوپر سے دھرماتما بننا ہوا ہے۔ ویسے اندر سے کڑھندا ہے اور بے انتہا متعصب۔ آپ کو علم نہیں۔ آپ تو صرف ظاہر پر جاتے ہیں۔ یہ لالے بڑے چالاک ہوتے ہیں اور یہ جو سیوا سمیٰ شروع کر کرھی اس نے یہ محض دھکاواہ ہے۔“

”یہ جو موٹا ریاض ہے نا۔ مدرسے کا سارا پیسہ لھا گیا ہے۔ لیکن ہے اس قدر چالاک کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا۔ ایک روز بھانڈا بھولے گا تو پتہ چلے گا۔ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا بھیک نہیں ورنہ جب بات نکلے گی تو ساتھ دھر لئے جاؤ گے۔“

ایلی کو شاء اللہ سے قطے کوئی بھی نہ تھی۔ لہلہ اس کی باتوں کو غور سے ساختا تھا۔ لیکن اس میں اتنی جماعت نہ تھی کہ شاء اللہ سے اپنا چیخھا چھپ رہا تھا۔ اس کے بر عکس وہ اس کی باتیں سن کر مجبوری سے تعجب بھری آوازیں کہتا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔“
یا۔ ”کیا واقعی۔“ یا ”ارے ایسا معلوم تو نہیں ہوتا۔“

شاہ وال پہنچ کر زندگی میں پہلی مرتبہ ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ سبھی اساتذہ اس کے راز سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ چھوپھوں کی ماں کو بھگا کر لے آیا ہے اور وہ اس بات پر شرم محسوس کرنے لگا تھا۔

ایلی کے لئے سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں۔ ان کے تھیقہ گھر سے باہر نہ ہونے لگے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر راہ گیر رک جاتے تھے۔ اور کہتے اچھا یہ ہے آصفی صاحب کا گھر جب وہ سکول جاتی تھیں تو راستے میں لوگ خصوصاً نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مارتے۔ مسکراتے اور کوئی عاشقانہ گیت گنگتاتے ہوئے بامعنی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے۔

ان باتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شبہات کا ایک طوفان پیدا ہو رہا تھا۔ ایلی ان لڑکیوں کی معصومیت سے واقف نہ تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ہر لڑکی اپنا آپ نہ شر کرنے پر فطری طور پر مجبور ہے۔ اس کا شعور نہ تھا کہ لڑکیوں کی مسکراہیں کسی ٹھوں

مقصد کے شور سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے تھقہے لوگوں کی توجہ جذب کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی خاص شخص کو لبھانے کے لئے نہیں ہوتے۔ وہ اس امر سے ناواقف تھا کہ غفوں شباب میں لڑکی کسی تحسین بھری نگاہ کو رد نہیں کر سکتی۔

حالانکہ اس سے اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔
ان وجہات کی بنابر ایلی کو معصوم را کیوں سے شکایات پیدا ہوتی جا رہی تھیں اور یہ شکایات تعصبات کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

اقتصادی مشکلات کی وجہ سے شہزادی میں ایک اداکی اور احساس محرومیت پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی وہ رنگینی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی طبعی شوغی اب محض روایت سی معلوم ہوتی تھی۔ اگر چہ اس کی صحت پیدا کی نسبت بہت ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں وہی تلویح پیدا ہوئی جا رہی تھی۔ جو ایک ایسی عورت میں پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی بہت خوبصورت رہی ہو اور جسے احساس ہو کہ وہ اپنا حسن کھو چکی ہے۔ شہزادو کو ایلی کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ اسے اب بھی ایلی وہی لگا دھماکہ۔ لیکن اس کے اظہار کے موقعے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی کوئی بات شروع کرتے تو نہ جانے کیسے وہ بات کسی نہ کسی اقتصادی مشکل پر آ ختم ہوتی اور بات کی رنگینی تلویح میں بدل جاتی۔

کبھی کبھار لا ہور سے محمود آ جاتا۔ میم کے چلے جانے کے بعد وہ تنہارہ گیا تھا۔ لیکن اس کی شخصیت میں بلا کی جا ذہیت تھی۔ میم کے جانے کا اس پر اڑ ضرور ہوا تھا۔ لیکن وہ اس قدر گہرانہ تھا۔ کہ اس کی شخصیت کی بنیادوں کو ہلا دیتا۔ ایلی کی دانت میں محمود از لی طور پر ایک ایسا لڑھکتا ہوا پتھر تھا۔ جسے ہر لڑکھن نئی چمک عطا کرتی ہے۔ دوار ہے سے واپس آئے ابھی انہیں دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایلی کو معلوم ہوا کہ شہزاد امید سے ہے۔ لیکن شہزاد کو شبہات تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ کہہ رہی تھی۔ لا ہور ہسپتال والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ پچھے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوا بھی تو ماں کے لئے خطرے کا باعث ہو گا۔ لیکن امید اکی تمام علامات واضح

تمہیں۔

”نه جانے کیا ہے۔“ شہزادے کہا۔ ”یہ علامات شاید کسی آنے والی بیماری کا پیش خیمہ ہوں۔“

اہر یا پاگل خانہ

”تم تو خواہ مخواہ شکر لیتی ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”میری طبیعت تو شکن نہیں۔“ وہ بولی۔ ”شکن تو تم ہو۔“

”پھر مجھے شکر کیوں نہیں پڑتا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”مجھے کیا معلوم ہے شہزادے؟“

”میں بتاؤں شہزادے،“ ایلی نے کہا۔ ”چلو ایک بار پھر دورا ہے جا کر رہا شم سے ملیں۔“
ہاشم کا نام سنتے ہی وہ گھبرائی۔ ”میں نہیں جاتی۔“
”کیوں۔“

”وہ تو دیوان ہے۔“

”پڑا ہوا ہمیں اس سے مطلب۔“

شہزاد دو را ہے جانے کے لئے تیار ہوئی تو اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے شہزاد کا معاشرہ کیا اور پھر مسکرانے لگی۔ ”تمہیں بچہ ہونے والا ہے ظاہر ہے کہ تم امید سے ہو۔“ لیکن تمہاری صحت اچھی نہیں تمہیں خوراک کی ضرورت ہے۔“

اب بھی شہزاد کو یقین نہیں آتا تھا۔

چھ مہینے بعد وہ پھر بیمار پڑ گئی اور صاحب فراش ہو گئی۔ ایلی گھبرا گیا اور اس کی ملتیں کرنے لگا کہ ایک مرتبہ دورا ہے چلے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی لیکن جب تکلیف بہت بڑھ گئی تو وہ راض ہو گئی اور وہ دونوں دورا ہے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس مرتبہ بھی صحیح کی گاڑی سے روانہ ہو کر شام کو تین بجے کے قریب دو را ہے پہنچ
ہاشم کا معمل خالی پڑا تھا۔ واکٹر ہاشم اسی طرح کمبل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔

ایلی نے اپنی آمد کا اعلان نہ کیا۔ بلکہ شہزادوں سمجھا دیا کہ تم پچکے سے اپنا ہاتھ بڑھادینا
تاکہ ڈاکٹرنیپس دیکھ لے۔ ایلی ڈرتا تھا کہ کہیں واکٹر پر طبعی جنون کی وجہ سے اسے
دیکھنے سے انکار نہ کر دے۔

”کون ہے؟“ ڈاکٹر نے آوازن کر پوچھا۔

”مریض۔“ وہ بولی۔

All rights reserved.
© 2002-2003 www.Sohail.com

”اس وقت نہیں۔“ وہ بولا۔ ”صحیح آئا۔“

”بہت دور سے آئی ہوں،“ شہزادے نے کہا۔ ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

”کتنی دور سے؟“

”شاہ وال سے۔“ وہ بولی ”آج واپس جانا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ بولا۔ ”تو دکھانیپس۔“ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ کمبل سے باہر نکالا اور وہ
شہزادوں کی نسبت دیکھنے لگا۔ دیکھا وہ چونکا۔ ”اوہ۔“ وہ بولا۔ ”معاملہ تو خراب ہے۔ بہت
خراب ہے۔“

شہزادہ خاموش بیٹھی رہی۔

”بچتو گل گیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اور اگر تم بروقت نہ آتے تو۔۔۔“

”آپ نے پہلے بھی دوائی دی تھی۔“ ایلی بولا۔

”کب؟“

”چھ مہینے ہوئے۔“ وہ بولا۔ ”آپ نے کہا تھا جسم اندر سے گل گیا ہے۔“

”دی ہو گی دی ہو گی۔“ واکٹر چلا یا۔ ”لیکن معاملہ پھر بگڑا ہوا ہے۔“ اس نے کمبل
سے سر نکالا۔ ”یہاں روز مریض آتے ہیں۔“ وہ چلا یا۔ ”سینکڑوں آتے ہیں۔“ میں
کیا یا درہتا ہے۔ کہ کس کو کیا دوائی دی تھی۔ یہ دیکھو۔“ ڈاکٹر نے اس قالیں کا کونہ

جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس کے نیچے خطوط کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ”دیکھو۔“ وہ بولا۔ ”یہ سب مر یعنوں کو خط ہیں۔ ان سب کو کون جواب لکھے۔ خواہ مخواہ خط لکھتے چلے جاتے ہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”میاں۔“ وہ پھر بولا۔ ”تم کیا خدا ہیں۔ صحبت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے صحبت دینی مطلوب ہوتی ہے۔ ہمارے ہاتھ سے صحبت دوں۔ کھوادیتے ہیں۔ ورنہ یو نہیں انا پ شناپ وہاں مل جاتی ہے۔ سب اللہ کی شعبدہ بازی ہے کون حکیم ہے اور کون ڈاکٹر سب ڈھونگ ہے۔ ڈھونگ۔“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

”تم کیا کام کرتے ہو۔“ اس نے ایلی سے پوچھا۔

”جی۔“ میں نے پڑھاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تم پچھے پڑھاتے ہو۔“ اس نے ایلی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”تم اس کام کی الیت نہیں رکھتے۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”اور تم یہ کام کرو گے بھی نہیں۔“

”جی۔“

”چھوڑ جاؤ گے۔“ ڈاکٹر نے پھر اپنا منہ کمبل سے ڈھانپ لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔ ”تمہاری زندگی میں گڑ بڑ ہے۔“ وہ بولا۔ ”ورا نبض دکھاؤ۔“ اس نے ایلی سے کہا اور اپنا ہاتھ کمبل سے نکال کر ایلی کی نبض دیکھنے لگا۔ دریتک نبض ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھا رہا۔

”سب کچھ غلط ہے۔“ وہ بولا۔ ”مرے سے سب کچھ غلط۔ دل و دماغ اعضاء سب غلط ہیں۔ سب الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ سودا کی طرف مائل ہو۔ صفر احتک پہنچ چکا ہے۔ پا گل ہو جاؤ گے۔“ وہ بولا۔ ”یقیناً ہو جاؤ گے۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت

ہے۔ ”اس نے کہا صرف ایک اگر ادھرنہ پہنچ تو مینٹل ہسپتال میں پہنچ جاؤ گے۔ اور وہیں مرو گے۔“

”ادھر کدھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ بھی ایک سمت ہے۔ ایک ایسی سمت جس سے تم واقف نہیں ہو۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔

”تو پھر ادھر پہنچ کا کیا امکان ہو سکتا ہے اگر میں ادھر سے واقف ہی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

ڈاکٹر ہنسا۔ ”وہی پہنچتے ہیں جو واقف نہیں ہوتے۔ بلاجے جاتے ہیں۔ اللہ نے بڑے پا کھند مچار کئے ہیں۔“ اس سے سر سے جبل پھرا تارویا۔

”تم اڑکی۔“ وہ شہزادی طرف دیکھ لے گواہ۔ ”تمہارا اس کا ساتھ نہیں چلے گا۔ دری تک نہیں چلے گا۔ تمہاری یہ بیماری _____ تمہیں لے جائے گی۔“ ہاں لے جائے گی۔ لیکن تمہارے پیٹ میں جو بچہ ہے جو گل چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ معمولی بچہ نہیں۔ بہت کچھ لے کر آئے گا، بہت کچھ عالی ظرف ہو گا۔ فنا کا رہو گا سماں اللہ۔“

وہ دفترا اٹھ بیٹھا۔ ”آ تو تمہیں پڑیا دیں۔“ وہ بولا۔ ”آ تو۔“

”ہاشم سے فارغ ہو کر وہ چپ چاپ شیشیں پر بیٹھے رہے۔ شہزادا پنے ہی خیالات میں کھوئی ہوتی تھی۔

”کچھ سوچ رہی ہو۔“ وہ شہزادے پوچھنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

ڈاکٹر کی باتوں پر دھیان نہ دو ایلی نے کہا۔ ”وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ دیوانہ بھی ہے۔ بہت بڑا فلسفی بھی ہے۔ روحانیات سے بھی شغف رکھتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ شاید تم سوچ رہی ہو کہ واقعی ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں

گے۔“

”وہ تو میں دیر سے جانتی ہوں۔“ شہزادی بولی۔

”کیا؟“

یہی کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے اور میں چلی جاؤں گی۔ لیکن ایلی ایک بات ہے۔

”کیا؟“

شہزادے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”میرے جانے سے پہلے کہیں مجھے چھوڑنا جانا۔“

”پا گل ہو گئی ہو۔“ وہ بھٹکا۔

”بس مجھے یہی ایک فکر ہے۔“ شہزادے کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں کیا؟“

”ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن پتھر نہیں کیوں یہ خیال بار بار میرے دل میں اٹھتا

ہے۔“

وہ قہقہہ مار کر نفس پڑا۔

جب وہ شاہ وال پہنچ تو شہزادے کی طبیعت پہلے کی نسبت بہت تھی۔ پھر روز بروز اس کی طبیعت بہت ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہو گئی۔

صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ اوس رہتی تھی۔ کئی بار بیٹھے بیٹھے جب اس کی نگاہ بڑی لڑکیوں پر پڑتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ دراصل اسے لڑکیوں کا غم کھانے جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ان لڑکیوں کے لئے کوئی رشد نہیں ملے گا۔ چونکہ وہ اس کی بیٹیاں تھیں۔ کوئی عزیز نیار شستہ داران سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ شہزادے اپنے اس خیال کے متعلق ایلی سے بھی کئی بار بات کی تھی لیکن ایلی اس کی بات پر نہس دیتا تھا۔ ”ابھی سے کیوں فکر کرتی ہو۔“ وہ کہتا۔

”میرے پاس زیادہ وقت بھی ہو۔“ شہزادہ جواب دیتی۔

اس پر ایلی چڑھ جاتا۔ ”کیا واقعی تم یہ خیال دل میں لیے بیٹھی ہو کہ تمہارے پاس

زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا۔“ شہزاد پوچھتی۔

”پاگل ہو۔“ وہ چلاتا۔ ”خواہ مخواہ کے فکر لگائے بیٹھی ہو۔“ اسے واقعی اس بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ لیکن اس کے غصے نے بھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

بھارت سستم

ایک روز شاء اللہ پنی بیوی کو ان کے بان لے آیا۔ اس کی بیوی بڑی لڑکی صبیحہ کی وکھت ہی چلاتے لگی۔

”ہے کتنی پیاری بیٹی ہے۔ تمہاری۔“ اسیں واری جاؤں۔ آمیں تجھے پیار کروں۔“ اس نے صبیحہ کو اپنے پاس بیٹھا دیا اور اسے پیار کرنے لگی۔

صبیحہ حیران تھی وہ زیریں بننے جا رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک بیگانہ عورت اس پر اس قدر مفتون کیوں ہوئی جا رہی ہے۔ شہزاد کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔

اگلے روز ہی بھاندا پھوٹ گیا۔ شاء اللہ اپنے چھوٹے بھائی کا پیغام لے کر آ گیا۔

”صبیحہ کو تو ہم نے اپنی بیٹی بنالیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”میری بیوی تو اسے دیکھ کر اپنا دل دے چکی ہے۔“ کل سے اسی کی باتیں کرتی ہے۔ بات بات پر اسی کا تذکرہ اگر آپ ہم غریبوں کا پیغام منظور کر لیں تو بہت کرم نوازی ہو گی۔“

چند ہی روز کے بعد شاء اللہ نے اپنے دونوں بھائیوں کو شاہ وال بلا لیا تاکہ وہ ایلی سے مل سکیں۔

اس کا بڑا بھائی ذکا و اللہ شکل و صورت اور بات چیت سے خالص فنکار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بال گیسوؤں کی طرح لمبے تھے۔ چہرے سے خوش مذاقی اور ذہن چمک واضح تھی۔ گفتگو نہایت پر اخلاقی اور آواز بہت رسیلی تھی۔ شاء اللہ کے بیان کے مطابق وہ سیکرٹریٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

چھوٹا بھائی ضیاء ابھی نوجوان ہی تھا۔ اس نے الیف اے تک تعلیم پائی تھی اور

آنکھوں میں نسوانی چمک تھی۔

شہر اور ایلی ان سیمل کر بے حد خوش ہوئے۔

”لو۔“ ایلی نے کہا۔ ”تمہارا یہ غم بھی دور ہو گیا۔ صبیحہ کو اچھا رشتہ مل گیا۔“

”اونہوں۔“ شہر اولیوی۔ ”میں خوش نہیں ہوں۔ الیف اے سے کیا ہوتا ہے آج کل اڑکا پوری طرح تعلیم یا فتنہ نہیں اور جب تک اے مناسب ملازمت نہ مل جائے میں یہ کام نہیں کروں گی۔“

”تو کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”آپ نے یہ سب جانتے ہو ہے پیغام دیا تھا۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”ذکاء زندگی بھر بیر وی مالک میں گھوما ہے۔ وہ ان باتوں کو درخور اتنا ہے۔“

دو ایک ماہ کے بعد ایک روز شہر اولیی اکٹھے لا ہو رجائے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچ کر شہر اونے کہا۔ ”اب جو یہاں آئے ہیں تو ذکاء اور ضیاء سے مل کر جانا چاہئے۔ انہیں علم ہو گا کہ ہم لا ہو رائے تھے اور ملے بغیر چلے گئے تو وہ برا نہیں گے۔“

یہ سوچ کرو وہ دونوں انارکلی گئے وہاں انہوں نے پھو وغیرہ خریدا اور پھر مال روڈ کی طرف چل پڑے۔ انہیں سرف یہ معلوم تھا کہ ضیاء اور ذکاء اکٹھے ۱۱۳ کی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ دریتک وہ مال روڈ پر گھومتے پھرے۔ لیکن انہیں ۱۱۳ نمبر کی کوٹھی کا پتہ نہ چلا۔ آخر ایک دو کان پر گیا۔ پان فروش سے پوچھا۔ ”بھائی ۱۱۳ کی کوٹھی کون سی ہوئی۔“

”۱۱۳۔“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس پر دوچار آدمی اور آگئے۔

”بھائی صاحب کچھ اتا پتہ دیجئے خالی نمبر سے تو کام نہیں چلے گا۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”بھائی ان کا نام ذکاء اللہ ہے یہاں سیکرٹریٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”کتنے بھائی ہیں۔“ ایک نے پوچھا۔

”دو بھائی ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ارے“ ایک چلایا۔ ”وہ ناچ تو نہیں کیا؟“

اس پر ان سب نے غور سے ایلی اور شہزاد کا جائزہ لیا۔

”ارے نہیں۔“ ایک بولا۔ ”وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ بھائی انہیں ملنے تو میمیں آتی ہیں۔“

”ناچے“ ایلی سن اڑکر رایا۔ ”ناچے کا کیا مطلب؟“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

”معلوم نہیں جی۔“ ایک شخص بولا۔ آپ ان پہلے بنگلوں میں دیکھیں۔ شاید وہیں ہوں۔“

ایلی ان بنگلوں کی طرف چل پڑا۔ شہزاد تانگے میں بیٹھی رہی۔

سامنے بنگلے سے موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بنگلے کے گول کمرے پر بورڈ آؤین اس تھا۔ ”بھارت سیتم۔“ گول کمرے میں سازنگیت کاریکارڈ چل رہا تھا۔ کس قدر صاف آواز تھی۔ کیسا اچھا بجہ تھا۔ ایلی نے قریب جا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ایک جوان حسین و جمیل لڑکی ناچ رہی تھی۔

”ارے“ وہ گھبرا گیا۔ ”کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔ انگریز تو نہیں۔ ہندوستانی معلوم ہوتی ہے۔“ ایک ساعت کے لئے وہ کھڑا دیکھا رہا۔

وختا اس گول کمرے سے ایک نوجوان باہر لکلا۔ ”ارے وہ ضیاء تھا۔

گریٹی گن گلی

”آخاہ ضیاء ہے۔“ ایلی چلایا۔ ”یا ہمیں نمبر ۳۳ امتا ہی نہیں تھا۔ دیر سے تلاش کر رہے ہیں۔“

ایلی نے یوں محسوس کیا جیسے ضیاء چپ چاپ کھڑا اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہو۔
ایک ساعت کے بعد ضیاء بولا۔

”اس بلاک کے پچھوڑے میں ہے۔ ہمارا گھر۔“

ایلی اور ضیاء شہزادوں ساتھ آئے اور ضیاء نہیں اس بلاک کے پچھوڑے کی طرف لے گیا۔ گول کمرے کے قریب پہنچ کر ایلی نیت دیکھا کہ موسیقی بالکل بند ہو چکی ہے اور کمرے میں کوئی بھی نہیں۔

ذکا نہیں بہت تپاک سے ملا۔ ”آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہ دی۔“ وہ بولا۔

”ویسے ہی آئے تھے۔“ شہزادوں ”تو ہم نے کہا آپ کوں میں۔“

”پھر بھی اطلاع دینا مناسب ہوتا ہے۔“ خواہ مخواہ آپ کو گفت ہوئی۔ ”ذکاء نے دغدغابات بدلتی۔“

چند منٹ بیٹھنے کے بعد ایلی اور شہزادے اجازت طلب کی۔ ”گاؤں چلنے میں صرف ایک گھنٹہ رہ گیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

ضیاء اور ذکاء نہیں تانگے تک چھوڑنے آئے۔

جب وہ اکیلے رہ گئے تو شہزادوں ”ان کے گھر تو کوئی بھی عورت نہیں۔“

”ذکاء کی بیوی تو مر چکی ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”مجھے یہ بات یاد ہی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عورت ہو گی گھر میں۔“ شہزادے بولی۔

ابھی ان تانگہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایلی تانگے والے سے بولا ”بھی ذرا سُھرنا میں ذرا سُگریٹ لے آؤں۔“

اور وہ اسی دکان پر سُگریٹ خریدنے چلا گیا۔ جہاں سے انہوں نے پتہ پوچھا تھا۔ پنوڑی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور یہ سے با معنی انداز سے کہنے لگا۔

”کیوں بھاگی مل گئے تمہیں وہ لوگ۔“

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”مل گئے۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا بھاگی۔“ وہ بولا۔ ”کہ وہی ہوں گے۔“

”نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”وہ تو پہچلنے والا میں رہتے ہیں۔“

”اجی وہی ہیں میں جو ابھی آپ کو تانگے تک چھوڑنے آئے تھے۔“ پناہی بولا۔

”وہ بھائی ہیں اور ایک بہن بہت اچھا ناچھا ہے وہ بھائی خود سکھاتا ہے اسے ساری عمر مدراں میں رہا ہے ناؤں میں سے سیکھ کر آیا ہے۔“

بھارت سیم ایلی کے روپر و گول کمرے کا بورڈ لگایا۔

”آج ہی شو ہے بھاگی۔“ پناہی بولا۔ ”اپنے سپیشل میں ہو گا۔ ہم بھی جا رہے ہیں دیکھنے کے لئے۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپٹر مار دیا ہو۔

جب شہزاد کو ایلی نے پناہی کی بتائی تو وہ پنجے جھاؤ کر اس کے پیچے پڑ گئی۔

”لوگوں کا کیا ہے۔“ وہ بولی ”خواہ مخواہ بہتا لگاتے ہیں۔ اگر ان کی بہن ہوتی تو کیا وہ ہمارے سامنے نہ آتی۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے ان کے گھر اور گھر کی صورت ہی سے ظاہر تھا کہ کوئی عورت نہیں رہتی وہاں۔“

اس پر ایلی کو وہ لڑکی بیاد آگئی جو گول کمرے میں ناج رہی تھی۔

”کیا وہی ان کی بیشیرہ تھی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ۔“ ایلی سوچنے لگا۔

”تو پھر آج کی رات ہم بھی رہ جاتے ہیں۔“ ایلی نے شہزاد سے کہا۔

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”وہ کہتا تھا آج شام کو ان کا شو ہے اور ان کی بہن ناچے گی۔ چلو آج دونوں شو دیکھیں گے۔“

شہزاد اس کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس کے بغیر انہیں حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا

تھا۔ لہذا وہ مجبوری میں ایلی کی بات مان گئی۔

شام کو جب وہ کیپٹل میں پہنچ تو اشتہاری میں لکھا تھا۔ بھارت سیتم کا شاہ کار شریعتی گن گلی پیش کریں گی۔

شہزاد چلانے لگی۔ ”ناج دیکھے کو اپنا جی چاہتا تھا اس لئے بہانہ بنایا کہ لاہور کے گئے۔

ایلی خود جیران تھا۔ شریعتی گن گلی پڑھ کر وہ خود سوچ بچار میں گھوگیا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ وہی حسین و جمیل لڑکی ہے ایلی نے گول بکرے میں دیکھا تھا۔ سچ پڑا۔ اس نے ناظرین کو دونوں ہاتھ جوڑ کو سلام کیا پھر یورپین فیشن کے مطابق جھکی اور پھر قتل کی طرح مخور قصہ ہو گئی۔ اس کی حرکات میں لے تھی۔ اعضاء میں بلا کی چمک تھی اور چہرہ مسکراہوں سے بھر پور تھا۔ ایلی بھول گیا کہ وہ کیوں شود یکھنے آئے تھے اور انہیں کس بات کا پتہ چلانا تھا۔

شریعتی نے تین سو لوناج پیش کئے۔ چوتھے ناج میں اس کے ہمراہ ایک نوجوان تھا۔ نوجوان کو دیکھ کر شہزاد ٹھٹھکی۔ ”یہ ضیاء معلوم ہوتا ہے۔“ وہ بولی۔

”ضیاء؟“ ایلی اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ ضیاء کون تھا۔ ”اوہ ضیاء کچھ دیر کے بعد ایلی بولا۔“ نہیں نہیں۔ کہاں ضیاء کہاں یہ رکا۔ یہ تو کوئی مدد اسی معلوم ہوتا ہے۔“ چوتھے ناج کے بعد انزوں ہو گیا اور ذکاء بنفس نفس نفیں سچ پڑا کر ناظرین کا شکر یہ ادا کرنے لگا۔ شہزاد ایلی کی طرف دیکھا۔ غصے سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

اگلے روز شاہ وال آتے ہوئے شہزاد گاڑی میں بیٹھی ہوئی رورہی تھی۔

”آخر نے کا مطلب۔“ ایلی بولا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ کہنے لگی۔

”ناچنا تو ایک فن سمجھا جاتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ ناج کوئی طائفہ ناج تو نہیں ہے۔ پھر تم کیوں دل بر اکرتی ہو۔“

”نہیں ایلی۔“ وہ بولی۔ ”وہ میری صبیحہ کو نچا گئیں گے۔ اس کے شوکریں گے۔“
”تو کیا ہوا۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو بھارت نیتم ہے۔ بھارت نیتم تو فن ہے۔ عیب
”تو نہیں۔“

”لیکن لوگ کیا کہیں گے،“ وہ بولی۔
”تم تو لوگوں کی پرواہ نہیں کیا کرتی تھی۔“ ایلی نے کہا۔
”اپنے لئے نہیں کرتی تھی نا۔“ وہ بولی۔ مٹڑ کیوں کے متعلق پرواہ کرنی ہی پڑتی ہے۔

”تو کیا انہیں جواب دے دوگی۔ ممکنی توڑ دوگی۔“ میلی نے پوچھا۔
”ہائے تو کیا تاچوں کو دے دوں اپنی بھی۔“ شہزاد اپنے جواب دیا۔

لاہور سے آنے کے بعد شہزاد پر مایوسی چھائی۔ ایک تو صبیحہ کی بنی ہنائی بات اٹوٹ گئی تھی دوسرے وہ بچے سے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل کی تھوں میں بیٹھا ہو غم چڑھا چڑھا اور غمے میں بدل گیا۔ بات بات پر اس کا غصہ جوش میں آ جاتا اور پھر بھوکی شیرنی کی طرح کچھار میں بیٹھ کر غراتی رہتی۔ ایلی اس کی اس تبدیلی پر سخن پا ہو جاتا ہے۔

وہ دن ان کے لئے نہایت تلخ تھے۔ وہ گھر جہاں ہر وقت دھماچوکڑی پھی رہتی تھی۔ تاش اور چوپٹ کی بازی لگی رہتی تھی جہاں لڑکیاں ناچتی تھیں۔ بچے قہقهہ لگاتے تھے وہ گھرویرانے میں بدل چکا تھا۔ حالانکہ ان کی مالی مشکلات کسی حد تک کم ہو گئی تھیں۔ چونکہ ریاض اور کپور کی کوششوں کی وجہ سے ایلی کو بورڈنگ کا سپر نشنڈنٹ بنا دیا گیا تھا اور اب وہ کرایہ کے مکان کو چھوڑ کر سرکاری کوارٹر میں مقیم ہو گئے تھے اس طرح اسے کچھ مالی امداد حاصل ہو گئی تھی۔ ایک تو اسے مکان کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا اور دوسرا ے ایک قلیل رقم الاؤنس کے بوریے ملنے لگی تھی۔

انہی دنوں ڈاکٹر ٹلینے ان کے سکول میں ایک جونیر ٹرک کی آسامی منظور کر دی
تحتی اور ایک نیا ٹرک اس آسامی پر مامور ہو کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ ایک نوجوان بی اے تھا۔ اس کا نام ناظم تھا۔ اگر چدیکھنے میں وہ نتوی بی اے نظر
آتا تھا اور ناس سے ناظم سے کوئی اعلان معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ ناظم شادی شدہ نہ تھا اور شاہ
وال میں نووا تھا اس لئے اسے بورڈنگ میں قیام کرنے کی وجہ سے ایلی اور وہ روزانہ
ملا کرتے تھے۔ پہلا روز جب ایلی نے ناظم کو دیکھا تو اسے پچھلی سمجھ میں نہ آیا۔ اگر
چہ ناظم نے سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کا سوٹ گویا سوب معلوم ہی نہیں ہوتا
تھا۔ اس کی شخصیت سوٹ اور بی اے دوںوں سے اپنے نیاز تھی۔ ناظم اے بی کورس کا
گرینجویٹ تھا۔ جب ایلی اس لفظیں کا علم ہوا تو وہ اور بھی حیران ہوا اس کے علاوہ
جب اسے یہ علم ہوا کہ ناظم ریاضی پڑھانے میں بڑی دسترس رکھتا ہے تو ایلی بالکل
ہی کھو گیا۔ شخصیت کو سمجھنے کے متعلق ایلی کو اپنے اندازوں پر بڑا ناز تھا اس کا خیال
تھا۔ کہ وہ شخصیت اور کردار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ناظم کو دیکھ کر اسے کچھ سمجھ
میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔

ناظم کے چہرے سے ذہانت کے آثار مترين شنبھیں ہوتے تھے۔ اس کے خدوخال
عام سے ہونے کے باوجود یہ احساس دیتے کہ ان کو سمجھنا آسان نہیں۔ اس کی
آنکھوں میں ہلاکا سافر ق تھا اس قدر ہلاکا کسی وقت دکھائی نہ دیتا اور نہ محسوس ہوتا لیکن
کسی وقت وہ اس قدر شدت سے واضح ہوتا جیسے ڈھول بجا بجا کر اپنے وجود کا
احساس دلار ہا ہو۔

ناظم سے چار ایک مرتبہ ملنے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ایک مجموعہ اضداد
تھا۔ مثلا اس کے چہرے پر ذہانت کا فقدان تھا۔ اس کے باوجود وہ اکثر ذہانت بھری
بات کرتا اور ایلی حیران سے اس کی طرف دیکھتا۔ ناظم کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ
محلی آدمی نہیں اور سو سائٹ سے دور رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن چند ہی دنوں میں ایلی

نے دیکھا کہ بورڈنگ کے تمام اڑ کے اس کے گرد جھر مٹ کئے بیٹھے ہیں تمام اڑ کے حجورے ہی عرصے میں ناظم کے مداح ہو گئے تھے۔ اور اس کے علم و قابلیت کے متعلق سارے سکول میں دھوم مج گئی تھی۔ اس کے علاوہ ناظم کے چہرے پر ہٹو دور رہو ناظم کی علامات ہر وقت موجود رہتی تھیں جو لوگوں سے میل جوں پیدا کرنے میں رکاوٹ بنی رہتیں۔ اس میں ایک واضح جھجک تھی۔ لیکن وہ حقیقت اس کا دل جذبات کی شدت سے بھرا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر شک پڑتا کہ وہ جذبات سے خالی ہے اور حیات سے کوئی لیکن حقیقت جذبات اور خصوصاً شدبت اس کے کردار کے بنیادی پہلو تھے۔

بے اے ہونے اور سوچ پہنچنے کے باوجود ناظم کی طبیعت امر تر کے ”بھا جی۔“ ناظم کی تھی۔ جو بہترین دوست اور بدترین دشمن ہوتے ہیں جو دھکاوے سے دور بھاگتے ہیں اور کسی کار عرب برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ناظم اور ایلی کی ووستی روز بروز بڑھتی گئی اس کی تمام تر ذمہ داری ناظم پر عائد ہوتی تھی۔ ہر روز شام کے وقت وہ ایلی کو آواز دیتا۔ ”اصفی صاحب۔“ اور پھر اسے ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ ایلی سیر و تفریح کا مشتاق نہ تھا۔ اس لئے وہ شام میں گھر پر ہی بسر کرنے کا عادی تھا۔ عام طور پر وہ اپنا وقت مطالعہ میں بسر کرتا۔ ناظم میں دلچسپی مخض کتابی ناظم کی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایسی عجیب و غریب شخصیت کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

ناظم کو بازار میں کھانے پینے کی بہت عادت تھی۔ مثلاً وہ سوڑا پینے کھڑا ہوتا تو سوڈے کی چھبوٹلیں پی جاتا کباب کھانا شروع کرتا تو دو درجن کباب کھا جاتا پہلے روز ہی جب اس نے دو درجن کباب کھائے اور اس کے اوپر تین میٹھی بولٹلیں پیں تو ایلی گھبرا کر بولا۔ ”کیا ہوا ہے تمہیں ناظم صاحب۔“ ”یاہ۔“ اس نے کہا۔ ”بہت دکھل گا ہوا ہے آج۔“

”دکھ۔“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ ”دکھ لگا ہو تو بھوک نہیں لگتی۔“

”مجھے تو بہت لگتی ہے اتنی لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی چیزیں پسیٹ میں جھونک دوں۔ اندر ایک خلا عپیدا ہو جاتا ہے جو بھرتا ہی نہیں“ ناظم نے جواب دیا۔

”کیا واقعی؟“

”ایمان سے۔“

”عجیب بات ہے۔“

”عجیب کہاں؟“ وہ بول کیون میر اوستور ہے مجھن سے ہی ایسا ہے۔

”آج کی غم ہے تجویں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”میرا دوست یکار ہے۔“ ناظم بولا۔

”دوست یکار ہے؟ کوئا دوست؟“

”آج چی خطا آیا ہے ساری دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔“ ناظم بولا۔

”ارے لس اتنی سی بات پغم ہے تمہیں۔“

”اتنی سی بات ہے۔“ اتنا ناظم نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”دوست کی بیماری بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا دکھ ہو سکتا ہے۔“

ایلی حیران تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ ناظم کی آنکھوں کا فرق نمایاں ہوتا جا رہا تھا اور تحریر کی بنابر ایلی کو علم ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھوں کا زاویہ جذبات کی شدت کی وجہ سے بدلتا ہے۔ ایسی صورت میں ناظم سے عقل کی بات کہنا اچھے اثرات پیدا نہیں کر سکتا۔ بہر حال ناظم کے آنے سے ایلی کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

نصیر اور شیر

پھر ان کے گھر نصیر اور شیر علی آگئے۔

شیر اور نصیر ایلی کے بھائی تھے وہ دونوں راجو کے لطف سے تھے فرق صرف یہ تھا کہ شیر علی راجو کے پہلے خواند سے تھا اور جب وہ علی احمد کے گھر آئی تھی تو اس کی گود میں

تھا۔ اور نصیر علی احمد سے تھا۔

نصیر اس زمانے کی پیداوار تھا۔ جب علی احمد بڑھا پے کے اوپر میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس لئے علی احمد نے غیر از معمولی محبت سے پالا تھا۔ اگرچہ یہ محبت خصوصی محبت تھی۔ جس میں علی احمد بیٹ کی جھلک تھی۔ لیکن اس کے باوجود نصیر کی جسمانیت یا شخصیت پھل پھول نہ ہوئی تھی۔ جسمانی طور پر وہ کمزور تھا اور اکثر بیکار رہتا تھا۔ طبعت کے لحاظ سے وہ جذباتی کمزور اور نیکی کی طرف مائل تھا۔ وہ بڑوں کا ادب کیا کرتا تھا۔ ماں بائی کا احترام کرتا تھا اور ایلی سے بہت متاثر تھا۔

نصیر کے پر عکس شیر علی جسمانی طور پر منقبوطاً تھا۔ اس کے جسم کے ساخت ہی اس بات کو واضح کرتی تھی کہ وہ آسفیوں میں سے غمیں اور علی احمد کے خاندان سے ہٹ کر ہے وہ طبعاً خاموش تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ دل کی بات چھپا کر رکھتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ وہ آدمی بنے۔ شیر علی میں جنسی پہلو کی شدت تھی اور اس شدت میں پراسراریت کا غصر تھا۔

دو سی پاس کرنے کے بعد شیر علی دوڑا ہے میں ایک ٹینکنیکل کورس کرنے کے لئے چلا گیا تھا اور ایک سال کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔

جب وہ واپس آیا تو اس قد بہت بڑھ گیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے جوان ہونے سے پہلے ہی جوان ہو گیا ہو۔ وہ گھر کی کسی بات میں با آواز بلند دفعہ نہیں دیتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ گھر میں اس کی پوزیشن ایسی نہ تھی۔ جیسے ایلی یا نصیر کی تھی یا شاید طبعاً وہ بات کہہ دینے کی صلاحیت سے بے گانہ تھا۔ لیکن ایلی محسوس کرتا تھا اس کے دل کی تھوڑی میں ان کی باتوں کا طومار لگا ہے۔ ایلی کو اس کی شخصیت کا یہ پہلو پسند نہ تھا۔

دورا ہے سے ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد علی پور آتے ہی شیر علی کو ایلی کی پرانی منگیتسرہ کی چھوٹی بہن عاصمہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو خفیہ خط لکھا

کرتے تھے اور لب بام کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور اشارے کیا کرتے تھے۔ لیکن شیر علی نے اس کے متعلق کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔

شیر علی کو محلے والے ہمیشہ بیگانہ سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ آصفیوں میں سے نہ تھا۔ حالانکہ میں بیشتر لوگ ایسے تھے جنہیں آصفی خاندان سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ کیونکہ بہت سے لوگ باہر سے آکر روہاں مقیم ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے متعلق کبھی صحیح جائزہ لیا تھا۔

شیر علی کے رومان کی بات باہر نہیں تو عاصمہ کی والدہ غصے بے بھوت بن گئی۔ اسے پہلے ہی علی احمد کے خاندان کے خلاف شکایت تھی۔ چونکہ ایلی نے اعلانیہ اس کی بڑی بیٹی شرہ سے شادی کرنے کا انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں منسوب تھے اور ان کی منگنی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔

اب جب اسے علم ہوا کہ شیر علی جان بو جھو کر عاصمہ کو ورنگار ہا ہے۔ تو وہ بھی کہ شیر علی کا مقصد صرف اس کے گھرانے کو بدنام کرنا ہے۔

ایلی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ راجو سے بات کرنے کے بعد خود عاصمہ کی والدہ زبیدہ سے ملا اور اس نے کوشش کی کہ زبیدہ شیر علی اور عاصمہ کی شادی پر رضامنہ ہو جائے اس پر زبیدہ کو اور بھی غصہ آیا۔ ایلی کی اتنی ہمت کہ وہ شیر علی کا پیغام لے کر آئے جب کہ اس نے شرہ کے سلسلے میں اس سے اس حد تک بد سلوکی کی تھی کہ آخر وہ شرہ کو نور علی سے بیا ہے پر مجبور ہو گئی تھی۔ حالانکہ شرہ اور نور علی میں بیس پچیس سال کا فرق تھا اور نور علی کی پہلی شادی سے ایک بیٹی تھی جس کی عمر شرہ سے کم نہ تھی۔

نصیر اور شیر علی بہت دیر کے بعد ایلی سے ملے تھے۔ کیونکہ شیر اور ایلی تو بن باسیوں کی سی زندگی بس کر رہے تھے اور محلے میں نہیں جاسکتے تھے۔ نصیر بڑی محبت سے ایلی کو ملائیں اپنی طبیعت کے مطابق خاموش تھا اگرچہ اس کے انداز میں رسمی ادب اور اخلاق بدرجہ اتم موجود تھے۔ وہ دونوں دو ایک روز شاہ وال رہے اور پھر واپس علی

پورچے گئے۔

ان کے جانے کے چند روز بعد ایک دن صبح سوریرے ہی لڑکیوں نے ایلی کو جگایا کے چند روز بعد ایک دن صبح سوریرے ہیللو کیوں نے ایلی کو جگایا۔ ”امی کی طبیعت اچھی نہیں۔ انہوں نے کہا۔ ایلی شہزادی کی طرف گیا۔ شہزادے نے اٹھنے کی کوشش کی اور دھرم سے گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ایلی گھبرا گیا۔ اور اٹھ کر ڈاکٹر کی طرف بجا گا۔ لڑکیاں ہم ہیں۔

جب وہ ڈاکٹر کو لے کر گیا تو وہ یکجا شہزادہ چارپائی پر پڑی کر رہی ہے اور اس کے پاس چارپائی پر ایک بچہ چپ چاپ پڑا ہے۔ لڑکیوں کی پاس ان کی پڑوسن بیٹھی مسکرا رہی تھی۔

ایلی نے غور سے بچے کی طرف دیکھا۔
اس کے سامنے ڈاکٹر ہاشم آ کھڑا ہوا۔ ”یہ بچہ۔“ وہ بولا۔ ”بہت کچھ لائے گا۔
بہت کچھ عالی طرف عالی۔ عالی۔“ ایلی کے کانوں میں ہاشم کی آواز گونج رہی تھی۔
”عالی۔“! ایلی نے بچے کی طرف دیکھا۔

”اور تم لڑکی۔“ ہاشم نے شہزادی کی طرف دیکھا۔ ”تم چلی جاؤ گی۔“
”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ شہزادے نے نگاہیں جھکائیں۔

ایلی باہر جنگلے میں نکل گیا اور کھڑکی میں سے شیشیں کی طرف دیکھنے لگا۔ شیشیں پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگ ادھر ادھر چل رہے تھے اس کے باوجود ایسے دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے تمام دنیا پر جمود طاری ہو۔ جیسے لوگ نیند میں چل رہے ہوں۔

عالی کی آمد کے بعد ایلی کے گھر میں ایک نئی دل چھپی پیدا ہو گئی۔ شہزادی کی بد مزاجی دور ہو گئی۔ لڑکیاں عالی میں کھو گئیں۔ سارا دن وہ اسے کھلا تیں۔ اٹھائے پھر تیں۔ عالی کے آنے سے گھر میں ایک بار بھر زندگی پیدا ہو گئی۔

ایک مرتبہ شہزاد اور ایلی کولا ہو رجانا پڑا۔

محمود اور نقلہ

جب وہ لاہور سے لوٹ تو شاہ وال میں محمود کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

ان دونوں محمود بی اے کر چکا تھا۔ اب وہ لاہور میں حکمہ تعلیم کے ہیڈ آفس میں پر
غذڈنٹ تھا۔ ایلی محمود سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ وہ پرانے ماتحتی تھے اور جب بھی
آپس میں ملے تھے علم و ادب کے علاوہ نفیسیات پر بحث کرتے یا پرانی باتوں کو
دہرا دہرا کر رہنا کرتے۔

rights reserved.
© 2002-2003

شام کے وقت محمود اور ایلی دونوں سیرے لئے باہر نکل گئے تو محمود نے بات چھیڑ
دی۔ کہنے لگا۔ ”ایلی یاد تم ان لوگوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ اس گھر میں
خوش نہیں ہیں۔“

شادی کی بات تو خیر ٹھیک تھی۔ لیکن یہ سن کر وہ گھر میں خوش نہیں ایلی چونا۔

”خوش نہیں ہیں۔“ ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خوش
نہیں۔“

محمود اپنے پر اسرار انداز سے مسکرا کر عورتوں کے معاملے میں اس کی شخصیت میں
ایک عجیب سی پر اسرار بیتھتی تھی۔ وہ بات کھل کر نہیں کرتا تھا۔

”انہوں نے مجھے خود بتایا ہے۔“ وہ بولا۔

”خود بتایا ہے۔“ ایلی نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہا۔“ وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ”جب میں کل یہاں پہنچا اور مجھے معلوم ہوا کہ تم
گھر پر نہیں ہو تو تمہاری غیر حاضری میں میں نے تمہارے ہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا
لیکن۔“ وہ رک گیا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ ”انہوں نے خود مجھے ٹھہر نے پر مجبور کیا۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ
مسکرا کر ”نوفاول پلے آفسٹ اور پھر رات کو نفیسہ میرے پاس آگئی اور دریتک بیٹھی

روہی۔ روہی رہی۔ ”ایلی نے پھر حرث سے اس کی طرف دیکھا۔

”لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ انکی زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ اور ان کا مستقبل تاریک ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ جلد ان کی شادیاں ہو جائیں تاکہ وہ اپنے گھر چلی جائیں۔“ محمود نے کہا۔

”لیکن شہر اداور میں____ ”ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

”اوہوں۔“ محمود بولا۔ ”تم دونوں لڑکیوں کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو۔ تم سمجھتے ہو کہ ان کی زندگی کا ظاہری پہلو ہی حقیقت ہے۔“

”تو کیا ان کی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہے؟“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ محمود بولا۔ ”اور ہمیں پہلو کے تخت وہ میرے پاس آئی تھیں۔ صبیحہ اندر دروازے میں کھڑی رہی اور نفیسہ میرے پاس آئی تھی اور وہ دونوں باتیں کرتی رہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”صبیحہ کے لیے رشتہ آیا تھا۔“

”ہاں وہ ناچے۔“ وہ بولا۔ ”مجھے انہوں نے سب بتایا تھا۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نفیسہ کا لکاح کرو۔“ محمود بولا۔

”لیکن کس سے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”محمود مسکرا لیا____“ ”تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں اس کا تمام خرچہ برداشت کروں گا اور جب تک وہ چاہے گی اسے تعلیم دلاؤں گا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔“

”تم____“ ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”میں! مجھ پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔“

”لیکن لیکن۔“ ایلی بولا۔ ”کیا وہ رضامند ہو جائے گی۔“

”کون۔“ محمود نے پوچھا۔

”نفیسہ اور کون۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”نفیسہ رضامند ہے۔“ محمود نے کہا۔ ”بلکہ وہ خود چاہتی ہے اور میں اسی کے کہنے پہت تم سے بات کر رہا ہوں۔“

ایلی کو دیکھ کا سالگرد اسے محمود کے خلاف شکایت نہ تھی اسے لڑکیوں پر حیرت تھی ”ویکھو مہمود۔“ وہ بولا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ اس بات کی خواہاں ہو اور اگر وہ خواہاں ہے تو شہزاد کو میں منا لوں گا۔“

مہمود کے جانے کے بعد ایلی نفیسہ کو ایک طرف لے گیا۔

”نفیسہ۔“ اس نے بات شروع کی۔ ”نفیسہ ایک بات بتاؤ مجھے۔“

نفیسہ نے پر اسرار نگاہ سے اس کی طرف ویکھا۔

”تشریف کی کوئی بات نہیں۔“ وہ بولا۔ ”جو بھی تمہاری صحیح رائے ہو وہ مجھے بتا دو چونکہ میں تمہاری رائے کے بغیر تمہاری رضامندی کے بغیر کچھ نہ کروں گا۔“

نفیسہ نہ آنکھیں جھکا لیں۔

”کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔“

وہ چپ چاپ بٹ بنی کھڑی رہی۔

”اگر تمہاری شادی محمود سے کر دی جائے تو تمہیں اعتراض تو نہ ہو گا۔“ ایلی نے پوچھا۔

نفیسہ جوں کی توں چپ چاپ کھڑی رہی۔

”جواب دو گا۔“ وہ بولا۔

وہ خاموش رہی۔

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”اگر تم نے کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم رضامند ہو۔“

وہ جوں کی توں خاموش کھڑی رہی۔